رُوحوں کے رِشتے

صبح مجاہد اور مجاہد حسین کی آپ بیتی

مجاہد حسین 1910ء میں بے پور کے ایک متوسط گھرانے میں شیخ اعجاز حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ میرٹھ کالج میں ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور وکیل بننے کے خواب کو قربان کر کے امپریل سیکرٹریٹ میں ساٹھ روپے ماہوار پر اس لیے کلرکی اختیار کر لی کہ شادی کے لیے ان کی منگیتر "صبح مجاہد" کے گھر والوں نے سرکاری نوکری کی شرط عائد کر دی تھی۔ مجاہد حسین نے دوران کلرکی ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھی اور اس فن میں ایسا کمال حاصل کیا کہ بیگم شائستہ اکرام اللہ جیسی شخصیت کو یہ کہنا پڑا کہ "ہندوستان بھر میں صرف مجاہد حسین ہی ٹھیک اور صحیح ٹائپ کرنا جانتے ہیں۔" مجاہد حسین نے ہی بیگم شائستہ اکرام اللہ کا "پی ایچ ڈی" کا مقالہ ٹائپ کیا تھا۔ جس کی ایک کاپی مجاہد حسین کو اپنے دستخط کے ساتھ دیتے ہوئے اُنہوں نے لکھا تھا کہ "برصغیر ہندوستان کے بہترین شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ کو" اسی طرح خود قائد اعظم محمد علی جناح جیسے عظیم رہنما بھی مجاہد حسین کی شارٹ ہینڈ کے معترف و قدر دان تھے۔

مجاہد حسین دسمبر 1937ء سے جون 1940ء تک بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ بلا معاوضہ منسلک رہے۔ یہ چیز بظاہر قائد اعظم کی عظمت و کردار کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی شخص سے کام لے کر اس کا معاوضہ ادا نہ کریں۔ مگر یہ اعزاز صرف مجاہد حسین کو ہی حاصل ہے کہ اُنہوں نے قائد کی بلا معاوضہ خدمت انجام دی اور تحفہ میں اُن کے ہاتھ سے لکھا ہوا تعریفی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس قیمتی ترین تحفہ کو مجاہد حسین نے ہمیشہ اپنی متاعِ حیات بنائے رکھا۔

مجاہد حسین نے 1933ء میں لوئر ڈویژن کلرک کی حیثیت سے سرکاری نوکری کا آغاز کیا۔ 1940ء میں محکمہ سپلائی سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ بنے اور 1944ء میں اُنہیں حکومتِ ہند کے محکمہ سپلائی میں انسپکٹر بنا دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مجاہد حسین محکمہ انکم ٹیکس میں اسسٹنٹ رجسٹرار تعینات ہوئے۔ 1963ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے وقت وہ وزارتِ قانون میں جائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

روحوں کے رشتے

اور اسی طرح کی کچھ اور باتیں

صبح مجاہد — مجاہد حسین

پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء ــــ ایک ہزار
دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء ــــ ایک ہزار

ناشر ــــــــ مجاہد حسین، الافق، ۳۳ بی،
پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹
خطاط ــــــــ محمود اللہ صدیقی (مرحوم)
ترتین ــــــــ عبدالرشید شاہد
طباعت ــــــــ مشہور آفسٹ پریس، کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

.... تکرارِ دوست

"روحوں کے رشتے" کا پہلا ایڈیشن بفضلہٖ توقع سے زیادہ مقبول ہُوا۔ اُس کا معاوضہ دُعائے مغفرت تھا۔ ایک دُعا بھی لگ گئی، تو بیڑا پار ہوگیا۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید کچھ کسر رہ گئی ہو، اس دُوسرے ایڈیشن کی اشاعت ضروری معلوم ہوئی۔

پہلے ایڈیشن کی ترتیب میں مجھے ذرا جلد بازی سے کام لینا پڑا، کیونکہ ایک پیش گوئی کے حساب سے مجھے ۱۹۷۴ء کے اختتام سے پہلے مرجانا چاہیئے تھا لیکن انتقال پُرملال کی جگہ انتقال پُرجمال ہوا، یعنی یہ کہ مرنے کے بجائے نومبر ۱۹۷۴ء میں مجھے یوگنڈا جانا پڑا، جہاں سے اب واپس آیا ہوں۔ یوگنڈا مملکتِ عیدی امین ——— فردوس بر روئے زمیں ہے، الاحور و غلماں۔ وہاں میں کافی حسین بھی معلوم ہونے لگا! اگر انتقال پُرملال کے بعد بھی نقشہ یہی رہا، تو بیڑا واقعی پار ہو جائے گا۔ سبحان اللہ و بحمدہٖ۔

اب یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ترتیب کو قائم رکھا جائے۔ البتہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کو شامل کرنا انتہائی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں چار خط ہیں، ایک[1] بیگم شائستہ اکرام اللہ کا، دُوسرا[2] الحاج خواجہ شہاب الدین کا، تیسرا[3] امتاز حسن مرحوم کا[4] اور چوتھا سید ہاشم رضا صاحب کا۔ یہ خطوط میرے اور میری مرحوم بیوی کے لئے سند

---

[1] صفحہ ۱۱ [2] صفحہ ۱۹ [3] صفحہ ۲۱ [4] صفحہ ۱۸

کا درجہ رکھتے ہیں، اور بذاتِ خود ایک یادگار چیز ہیں۔

اِن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کچھ اور تحریریں بھی چھاپی جائیں۔ اِس کے کئی مسودے ہیں، لیکن سب جناتی خط میں ــــــ اور بعض ادھورے۔

ایک[1] مقالہ ــــــ عورت کی تعلیم، ترقی اور آزادی، جو ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا تھا کچھ غنیمت نظر آیا، اور آل انڈیا ریڈیو کے اجازت[2] نامہ کے ساتھ اس ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اوسطاً عورت کی حالت آج بھی وہی ہے جو تیس پینتیس برس پہلے تھی!

میں اپنے مضامین کی اشاعت سے کچھ گھبرا سا گیا ہوں۔ وہ واقعات اور حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض افراد کو اس درجہ ناگوار گزرتے ہیں کہ بے جا تنقید سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بہرحال اخبار "جنگ" کراچی سے دو ترشے' ایک[3] "مارشل لا ریگولیشن نمبر چونسٹھ زرعی اصلاحات کا قانون کیونکر مُرتّب ہوا"، اور دوسرا[4] "ممتاز حسن مرحوم"، اس ایڈیشن میں درج کر رہا ہوں۔ میری تیس سالہ سرکاری مُلازمت کی آپ بیتی ــــــ "بسے رنج بُردم دریں سال سی" ــــــ شاید مرنے کے بعد بھی شائع نہ ہو، کیونکہ اس سے اولاد در اولاد مقدمہ بازی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اسی خیال سے ایک ایسی تحریر جو ادبی اور ذاتی دونوں لحاظ سے بیحد قابلِ قدر ہے یہاں محفوظ کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مراسلہ[5] ہے مولانا عبدالمجید سالک کا میرے والد محترم کے نام جو اٹھائیس برس پہلے لاہور سے کراچی آیا تھا۔ اب یہ دونوں بزرگ مرحوم ہیں: بزرگ زندہ نہیں رہا کرتے۔ اس سے ان دونوں دوستوں کی وضع داری اور صلاح مشورے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب ایسے دوست ڈھونڈے بھی نہیں ملتے!

---

[1] صفحہ ۶۳ [2] صفحہ ۶۹ [3] صفحہ ۷۱ [4] صفحہ ۱۶۵ [5] صفحہ ۸

ان چار خطوط کے علاوہ کئی اور خطوط بھی ملے۔ جن میں سے ہر خط بذاتِ خود ایک سند ہے، اور میرے پاس محفوظ ہے۔ ان میں سے ایک خط[1] جو خالہ اُم اسحاق صاحبہ نے غالباً طوعاً کرہاً اور کرہاً زیادہ، کافی سوچ وچار کے بعد انگریزی زبان میں ٹائپ کرا کر بھیجا، خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل نے ہمت افزا تبصرے کئے۔ ایک تبصرہ[2] برادرم والاشان مولوی محمد اظہار حسین قرنی نے اپنی تصنیف "دو آتشہ" میں شائع کیا ہے، وہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ چند صاحبان نے جا اور بیجا تنقیدیں بھی کیں۔ میں ان سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور دُعائے مغفرت کی ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔

اس کتاب کے خوش نویس جناب محمود اللہ صدیقی صاحب مذکورہ بالا مقالہ کی کتابت مکمل کرنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن باقی تمام کتابت اُن کے خاص شاگرد رشید شاہد صاحب نے کی، جو اس کی تزئین کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں تندرست اور خوش رکھے۔

اُل اُفق، کراچی:
۲۱ مئی ۱۹۷۸ء

---

[1] صفحہ ۲۳ [2] صفحہ ۷۶

مولانا عبدالمجید سالک کا مراسلہ مجاہد حسین کے والد محترم شیخ اعجاز حسین کے نام

Abdul Majid Salik

Daily Inqilab

Lahore _ 28.10.50

مکرم و محترم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا کارڈ ملا ۔ جب میں ستمبر میں کراچی گیا ۔ تو برادر عزیز مجاہد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ۔ لیکن چونکہ مجھے صرف ایک آدھ دن ہی وہاں ٹھہرنا تھا ۔ اسلئے میں آپ کا نیاز حاصل کرنے سے قاصر رہا ۔ اب انشاءاللہ پھر چند روز تک کراچی کا ارادہ ہے ۔ اگر یہ ارادہ پورا ہوا ۔ تو ضرور حاضر ہونگا ۔

تعجب ہے کہ آپ ساری عمر مصروفیت میں بسر کر کے اب آرام فرمانے کی بجائے بیکاری کی شکایت کرتے ہیں ۔ اب آپ مزے سے سیر و تفریح کیجئے ۔ اور کتابیں پڑھا کیجئے ۔ خدا کے لئے پھر کسی مصروفیت میں پھنسنے کی کوشش نہ کیجئے ۔ میرا مشورہ تو یہی ہے ۔ آئندہ اختیار بدست مختار ۔

"انقلاب" کے اجرا کے لئے دو لاکھ کی ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی بن گئی ہے ۔ اور روپیہ فراہم ہو رہا ہے ۔ چونکہ میں اس سے پہلے قلت سرمایہ کی وجہ سے خاصی پریشانی اٹھا چکا ہوں ۔ اسلئے جب تک ساٹھ ستر ہزار روپیہ جمع نہ ہو جائے گا ۔ اخبار جاری نہ کرونگا ۔ جہاں تین مہینے گزر گئے ہیں ۔ وہاں ایک آدھ مہینا اور گزر جائے گا ۔ تو کوئی حرج نہ ہوگا ۔ بنیاد مضبوط ہونی چاہیے ۔ تدبیریں کر رہا ہوں ۔ دعا آپ کا کام ہے ۔ اسلئے کہ آپ بزرگ بھی ہیں ۔ اور انقلاب کے پرانے محسن اور خیر خواہ بھی ہیں ۔

باقی خیر و عافیت ہے۔ برادر عزیز مجاہد حسین صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔
خواجہ صاحب تو غالباً ترکی یا پاکستان تشریف لے جا چکے ہوں گے۔
میرے لائق کوئی خدمت ہو۔ تو بے تکلف یاد فرمائیے۔ والسلام

سالک

اَسنادُ المُحسنینؒ

منجانب بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ بآدابہا

(محمد اکرام اللہ صاحب مرحوم اور الدکتور فاضلہ شائستہ سہروردیہ کے احسانات بُھلائے نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان میں بابو سے افسر تک میری ترقی کا خاص سبب اُن کی قدر شناسی تھی، ورنہ من آنم کہ من دانم! یہ دو الفاظ "بابو" اور "افسر" ـــ نیچے اور اونچے آدمیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے۔ بہر حال، بیگم صاحبہ کا آٹوگراف اُن کے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ پر جسے میں نے لندن یونیورسٹی کے اسٹینڈرڈز پر ٹائپ کیا تھا "روحوں کے رشتے" کے پہلے ایڈیشن میں صفحہ ۳۴ پر پیش کیا جا چکا ہے، اور اس ایڈیشن کے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اکرام اللہ صاحب مرحوم کا ایک مراسلہ بھی شامل کر رہا ہوں (صفحہ ۱۷) تاکہ ان کی تحریر بھی یادگار رہے)

۷۸۶

"روحوں کے رشتے"

بھائی مجاہد۔ السلام علیکم۔

آپ نے "روحوں کے رشتے" مرتب کر کے محبت کا حق ادا کر دیا۔ صبیح مجاہد کے چند افسانے اور ڈرامے اس کی بیدار مغزی، اس کی حساس طبیعت اور زبان پر مکمل عبور کی عکاسی

کرتے ہیں۔ صُبح مجاہد نے بہت تھوڑی زندگی پائی اور اس عرصہ میں بھی مسلسل بیماریوں کا شکار رہی۔ لیکن اس کے افسانے، اس کے مضامین اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی اور جسم زار نے مہلت دی ہوتی تو وہ نہ صرف ایک بڑی اچھی لکھنے والی ہوتی بلکہ حقوق نسواں کی ترقی کی زبردست علمبردار بھی۔ اس کا ہر افسانہ عورت کی مجبوری کی داستان ہے۔ وہم۔ بہو یا بیٹی۔ مہرباں کیسے کیسے ہر ایک افسانہ میں عورت کی بے بسی اور بیچارگی کو بڑے درد واثر کے ساتھ دکھایا ہے۔ ہر افسانہ معاشرہ کے ظلم کے خلاف احتجاج ہے۔ اس کے ظلم واستبداد کی تصویر ہے۔ اپنے آخری طویل افسانہ "رُوحوں کے رشتے" میں اس نے افسانہ نگاری کی طرف ایک نیا قدم بڑھایا ہے۔ مقصدی افسانوں کے بدلے یہ افسانہ تخیل اور کسی حد تک بعید العقل واقعات پر مبنی ہے۔ اور وہ اس میں ایک خاص اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو شاید اس میدان میں اور زیادہ پختگی حاصل کر لیتیں۔

ڈرامے دو ہیں۔ جس میں "بیوی کا انتخاب" کا انجام صحیح معنوں میں ڈرامٹک ہے۔ "فرسٹ پرائز" کا مطالعہ خوب ہے۔ ان کا مضمون "عورت کی زندگی پر ایک نظر" کس قدر مدلل ہے اور اس میں کتنی صحیح البیانی سے کام لیا گیا ہے۔ صحیح معنوں میں ازدواجی زندگی کو کیا ہونا چاہیے کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

ان کو پڑھتے ہوئے جب یاد آتا ہے کہ اس کی لکھنے والی کو بلا مبالغہ ایک رات بھی آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی، جس نے اپنی ساری عمر ایک ایسے موذی مرض کی گرفتاری میں گزاری، تو واقعی تعجب بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ میں جانتی ہوں کہ اس کے باوجود اس نے لکھنے پڑھنے سے، شوہر کی رفاقت اور بچوں کے پالنے سے، یعنی زندگی کے کسی کام سے گریز نہیں کیا۔

ان کی رفاقت اور صلاح ومشورہ اور ہمت بڑھانے کو آپ اپنی ترقی کی وجہ سمجھتے ہیں اور ان کی شفقت کی یاد بچوں کے لئے شمع راہ ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میری ملاقات صبیح مُجاہد سے ۱۹۴۰ء کی گرمیوں میں شملے میں ہوئی۔ آپ اس زمانے میں میرا مقالہ (Thesis) ٹائپ کر رہے تھے۔ ایک دن آپ نے ذکر کیا کہ آپ کی بیوی ادب سے دلچسپی رکھتی ہیں اس لئے مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے بڑے شوق سے لنچ پر بُلایا۔ اس وقت وہ ایک دُبلی کم عمر لڑکی تھیں۔ اُردو ادب اور سیاست پر باتیں ہوئیں۔ میں نے ان کو اپنا ہم خیال پایا۔ اس لئے مجھے اُن سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر دو چار بار اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں، بیگم زاہد حسین کے گھر، پھر کافی عرصہ بعد میں کراچی آپ کے گھر گئی۔ اب ماشاء اللہ تین بچے ہو چکے تھے۔ طبیعت اور بھی خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ میں نے آپ کی ترقی پر مبارکباد دی، اس پر مسکرائیں۔

پھر میں باہر چلی گئی اور کافی عرصہ باہر رہی۔ ان کے گزرنے کے بعد آپ انعام کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ آپ کے گھر کے پُر سکون اور باہمی محبت کی فضا اس کو بہت پسند آئی اور اس نے مستقل آنا جانا شروع کر دیا۔ میں مراکش میں تھی کہ اس کا خط آیا کہ صبیح مجاہد گزر گئیں۔ سن کر کس قدر رنج ہوا کہہ نہیں سکتی۔ واپس آ کر آپ کے ہاں تعزیت کو گئی تو آپ کو غم سے چور چور پایا۔ اب آپ نے "روحوں کے رشتے" مرتب کر کے ان کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اور اپنے زخمِ دل پر مرہم رکھ دیا ہے۔

آپ نے اپنی زندگی کے جو واقعات لکھے ہیں انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ جس بے جھجکی اور صفائی سے اپنے ساٹھ روپے ماہوار کی نوکری سے شروع کرنے کا حال لکھا ہے۔ یہ آپ کی اخلاقی جرأت اور آپ کا کسی قسم کے احساسِ کمتری سے یکسر آزاد ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ آج کل پاکستان میں یہ رویہ میں نے تو کم سے کم کسی اور میں نہیں دیکھا۔ ان غلط قدروں کے ماتحت جو کہ ہم میں پھیلی ہوئی ہیں، لوگ اپنی کم مائیگی کے زمانہ کو ایسا چھپاتے ہیں گویا کہ کوئی گناہ ہو۔ اور اس کوشش میں اس قدر جھوٹ بولتے ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے بلکہ ہنسی آتی ہے۔

اس کے برخلاف آپ نے ایک بار نہیں کئی بار اس کا ذکر کیا ہے اور بتدریج ترقی کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ واقعی یہ آپ کے بڑے ہونے کی دلیل ہے (بڑے یعنی روپیہ والے یا اہم عہدہ دار کے نہیں بلکہ اعلیٰ ظرف یعنی اصلی معنوں میں بڑے ہونے کی دلیل ہے۔) آپ نے صرف اپنی کوشش اور محنت سے جس طرح ترقی کی یہ بھی آج کل کے ان لاتعداد نوجوانوں کی رہبری کے لئے ایک نمونہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر سفارش کے ترقی نہیں ہوسکتی۔

آپ نے میرا سرٹیفکیٹ چھاپ کر بھی اس عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔ بھلا کوئی اور معمولی آدمی ایسا کر سکتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنے مقالہ (Thesis) کی صاف کاپیاں چھپوانے کے لئے پریشان تھی کوئی آدمی نہیں ملتا تھا جس کی انگریزی اور اردو میں اتنی لیاقت ہو کہ اس کو صحیح طور پر چھاپ سکے۔ ایک دن صاحب دفتر سے آئے اور کہا کہ ایک ٹائپسٹ ٹھیک کر آیا ہوں۔ ایم اے پاس ہے، وہ تمہاری ٹائپنگ کرے گا۔ اور آپ نے واقعی چار کاپیاں مقالہ کی مع Discritical marks اس قدر صاف اور اچھی ٹائپ کیں کہ دل خوش ہوگیا۔ مجھے .Ph.D کی ڈگری مل گئی۔ پھر میری Thesis چھپ گئی۔ اس کے کافی عرصہ گزرنے کے بعد آپ ایک دن کراچی ہمارے گھر آئے اور کہا۔ "بیگم صاحب! آپ نے مجھے اپنے Thesis کی کاپی ہی نہیں دی۔" ارے یہ تو بڑی بھول ہوئی لیجئے ابھی لیجئے۔" آپ نے کہا، اس پر کچھ لکھ دیجئے۔ میں نے کہا کہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ لکھوں کہ "برصغیر ہندوستان کے بہترین شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ کو" آپ اس وقت انکم ٹیکس اپالیٹ ٹرائیبونل کے رجسٹرار یا ڈرافٹسمین یا کچھ اور ہو چکے تھے۔ لیکن آپ نے مجھ سے یہی لکھوایا۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ اس شخص میں احساس کمتری ذرہ برابر بھی نہیں۔

مگر میرے لئے تو سب سے زیادہ دلچسپ اور بیش بہا وہ حصے ہیں جہاں آپ قائد کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ میرے نزدیک قائد کی ایسی جیتی جاگتی

بولتی چالتی تصویر کہیں نہیں ملے گی۔

قائد کے متعلق جب کوئی کچھ کہتے یا لکھتے ہیں تو وہ اُن کو ایک انسان کی حیثیت سے نہیں دکھاتے۔ یا تو انہوں نے کبھی قائد کو اس صورت میں نہیں دیکھا یا وہ شاید خام خیالی سے یہ سمجھتے ہیں کہ قائد کو اس طرح دکھانے میں اُن کی سُبکی ہوتی ہے۔ حالانکہ کسی بھی انسان کی اصلی طبیعت اس کے معمولی روزمرہ کے قول و فعل سے ظاہر ہوتی ہے۔ آپ اپنی بے پناہ عقیدت کے باوجود جو آپ کو قائد سے تھی، انہیں ہیرو کے رُوپ میں پیش نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں اس طرح بولتے چالتے دکھاتے ہیں جیسا کہ وہ بولتے چالتے تھے وہی ذرا بات کرنے کا اکھڑا اکھڑا طریقہ:

"نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کوئی اسکول تو نہیں اور تم نے کیا مجھے کنگال سمجھا کہ مُفت کام لوں۔"

"بڑے بے عمل آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"تمہارا بلا اُجرت کام کرنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"سرٹیفکیٹ! اوہ تو میں نے آج تک کسی کو نہیں دیا۔"

مجھے ان سطروں کو پڑھتے ہوئے قائد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کیونکہ وہ اسی طرح باتیں کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ قائد کا کھرا پن، کسی سے فائدہ نہ لینا، اپنے رسوخ سے فائدہ نہ اٹھانا، قول و فعل کی مناسبت یہ سب باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

آپ نے ان حالات کو لکھ کر قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ قائد کی ایسی تصویر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے نہیں لکھی۔ اور جو لکھ سکتے تھے وہ اب سارے خدا کو پیارے ہو گئے۔ اس لئے وہ اب کبھی بھی نہیں لکھی جائے گی۔

مس جناح پر آپ نے صرف ایک جگہ تھوڑا سا لکھا ہے لیکن ایسا لکھا ہے کہ ان کو بھی عین لبعین چلتے پھرتے دکھا دیا ہے۔ وہی قائد جیسا کھرا پن، بے لاگ لپیٹ بات کرنے کی عادت، جزرسی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخلصانہ دوستی، آدمی کی پہچان۔ آپ

سے جس بے تکلفی سے وہ "تو" کہہ کر باتیں کرتی تھیں اس میں کتنی اپنائیت اور خلوص تھا۔

یہ سب باتیں آپ نے چند صفحوں میں اجاگر کر کے رکھ دی ہیں۔ قائدِ اعظم کی کتنی جانفشانی سے خدمت کی، اور قومی کاموں میں کتنا حصّہ لیا —— لیکن ان پر تو کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

آپ نے "رُوحوں کے رشتے" لکھ کر ہمیں اپنے غم میں شریک کر لیا۔ اور اپنی چیدہ چیدہ یادداشت سے اپنی شخصیت کے کردار کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جو اب تک نظرِ عام سے پوشیدہ تھے۔ یہ آپ کا ہم پر احسان ہے۔ فقط۔

شائستہ سہروردی اکرام اللہ

محمد اکرام اللہ صاحبؒ کا مراسلہ

HIGH COMMISSIONER FOR PAKISTAN
LONDON

25th January, 1955.

My dear Mujahid:

Thank you very much for your letter. I am sincerely sorry that while I was in Karachi I could not see you despite my promise. My wife and I are very sorry to know that Mrs. Mujahid is not keeping too well. I can well imagine how unsuitable the climate can be to some persons. I have myself had a lot of illness which was entirely attributable to the Karachi climate.

I was distinctly surprised to get such a nice letter in Urdu. I was aware of your talents in English but I did not know that you were such a great master of the Urdu language and had such a beautiful handwriting.

With kind regards to all of you and love to the children.

Yours sincerely,

Mr. Mujahid Husain,
6/13-G, PECHS,
Karachi 4,
Pakistan.

بجناب السید ہاشم رضا صاحب بآداب

1175 York Avenue, 6P
New York City, 10021

باسمہٖ

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء

محبی، سلام مسنون، آج روزِ عید ہے، سب سے پہلے آپ کو عید کی تہنیت دیتا ہوں، پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، "رُوحوں کے رشتے" کے لئے جسے پڑھ کر دیارِ غیر میں وطن کی یاد بڑھ گئی، آپ نے اپنی شریکہ حیات کا ذکر جس پُرسوز انداز میں کیا ہے اس نے میرے مرحوم بھائی مسعود کی یاد تازہ کر دی، وہ مجھ سے عمر میں پونے دو سال چھوٹے تھے لیکن ہم دونوں کی نشو و نما جڑواں بھائیوں کی طرح ہوئی تھی، ان کے جانے سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے موت ہی پورا کر سکتی ہے، میں نے جناب سیماب اکبر آبادی کا جو شعر ان کے بارے میں پڑھا تھا وہی آپ کی شریکِ حیات کی جُدائی پر صادق آتا ہے،

میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل مرا مزار نہ پوچھ

منجانب الحاج خواجہ شہاب الدین (مرحوم)

(یہ سند خواجہ صاحب کے کاغذات میں سے اُن کی رحلت کے بعد بیگم صاحبہ کے ملاحظہ میں آئی، اور انہوں نے امانتاً اپنے پاس رکھ لی۔ میں اس وقت وطن سے بہت دُور تھا، واپسی پر تعزیت کے لئے حاضر ہوا، اور جب رخصت ہونے لگا تو بیگم صاحبہ نے میری امانت مجھے سونپ دی۔ اس کی قدر و منزلت کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں خواجہ صاحب مرحوم اور بیگم صاحبہ کے معیاری سلوک کی مثالیں یاد ہوں)

۲۱ بی فضیحہ سینٹرل لین
ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی
۱۵ نومبر ۸۴ء

عزیزم مجاہد حسین صاحب

آپ کی تصنیف "دُھوں کے رشتے" پڑھ کر دل پر گہرا اثر ہوا۔ آپ کے ادبی ذوق سے تو میں واقف ہوں لیکن آپ کی بیگم صاحبہ مرحومہ ایسی بلند پایہ ادیبہ تھیں اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ افسانے کیا ہیں۔ شستگیٔ زبان، ندرتِ خیال اور بلندیٔ افکار کے بہترین نمونے ہیں۔ اللہ مرحومہ کو غریقِ رحمت کرے۔ آپ نے اپنی زندگی کی سرگزشت قلمبند کرنے میں بے حد اختصار

کیا۔ میری آپ سے واقفیت ۱۹۴۶ء سے ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری طویل و مصروف زندگی میں دو چار ہی شخص ہوں گے جو آپ جیسے اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک ہوں۔ آپ کی زندگی ایمان داری، دیانت اور عمل پیہم کا حسین مرقع ہے اور اس کے قابلِ قدر و خوش گوار نتائج بھی سب کے سامنے ہیں۔

اس سے ہماری نوجوان نسل نہایت ضروری و مفید سبق حاصل کر سکتی ہے۔ میں اصرار کروں گا کہ آپ اپنے سوانح زندگی مکمل طریق پر قلمبند کریں۔ یقین عملی اور ٹھوس نمونے کی ملک کو بے حد ضرورت ہے۔ میرے دل میں آپ کی محبت اور بے انتہا قدر و منزلت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے۔ والسلام

سراج شہاب الدین

منجانب الدکتور فاضل ممتاز حسن (مرحوم)

۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء

دوستِ عزیز و محترم، میں تقریباً تین ہفتے ملک سے باہر رہا ہوں۔ واپس آیا تو "روحوں کے رشتے" کا ایک نسخہ میز پر رکھا ہوا ملا۔ میں نے پڑھا۔ آپ کا یہ مجموعہ ایک منفرد تصنیف ہے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، اُردو ادب میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ آپ کی اہلیہ مرحومہ کے افسانے بہت بلند پایہ ہیں، اور اگر ان کے علاوہ اور بھی افسانے ہوں یا کوئی تحریریں ہی ہوں تو انہیں ایک الگ مجموعے کی صورت میں بھی چھاپنا چاہیئے۔ رہی آپ کی اپنی تحریر، سو مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس پائے کے اہلِ قلم ہیں۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ خلوص سے پُر ہے۔ اور یہ وہ صفت ہے جو ہمارے اہلِ قلم میں مقابلتاً کم ہے۔ آپ کی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہر فقرے میں ایک خاص تاثیر ہے۔ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

میاں بیوی کے رشتے کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں۔ محبت وہ تعلق ہے جسے موت نہیں مٹا سکتی۔ مگر میاں بیوی کی محبت کو ابھی تک اُردو ادب نے پورے طور سے قبول نہیں کیا۔ ہمارے ہاں کا مقبول ادیب اکثر و بیشتر وہ ہے جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کے قصیدے لکھے اور اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتے۔ ہمارے عُلماء نے بھی نکاح کے فقہ پر مبسوط تصنیفات مرتب فرمائی ہیں مگر انہیں یہ کہنے کی کبھی اور کہیں توفیق نہیں ہوئی کہ میاں بیوی میں محبت بھی ہونی چاہیئے۔

میری اپنی بیوی کا انتقال پچھلے دسمبر میں ہُوا۔ اس وقت تک میری جو ذہنی اور روحانی کیفیت ہے اسے آپ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کی جو کیفیت ہے اسے میں سمجھ سکتا ہوں۔ وہ میری بنتِ عم تھیں۔ بچپن اکٹھا گزرا۔ ایک ہی گھر میں بڑھے کھیلے اور لڑے جھگڑے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ ہم دونوں کی شادی ہوگی تو اسے نہ انہوں نے ناپسند کیا نہ میں نے۔ تقریباً زندگی کے

پینسٹھ سال اکٹھے گزرے جو گھر انہوں نے بنایا، وہاں باہر کی دُنیا کی ہوا و ہوس، بغض و حسد اور فتنہ و فساد کو جگہ نہ تھی۔ گھر پہنچ کر میں محسوس کرتا تھا کہ قلعہ بند ہو گیا ہوں اور اب ہر غنیم کے حملے سے محفوظ ہوں۔ اب اگر اطمینان ہے تو یہ کہ اگر اُن کی جگہ میں چلا جاتا تو کیا ان کی بیوگی کا تصور میرے لئے قابلِ قبول ہوتا۔ آپ نے بھی یہ لکھا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہے۔ وہ سہاگن تھیں سہاگن گئیں۔ اب زندگی کیسے گزرے گی۔ کوشش کر رہا ہوں اپنے آپ کو مصروف رکھوں۔ جہاں تک ہو سکے مصروف رکھوں۔ اور جہاں تک توفیق ہو ان کے نیکی کے کاموں کو جاری رکھوں۔ ان کی دو مصروفیات سب سے زیادہ تھیں ایک تو بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور دوسری بچوں بچیوں کو سکولوں کالجوں میں داخلہ دلوانا۔ اس میں صحیح غلط کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ آدمی غریب ہے اور بے روزگار ہے تو اُسے ہر حال میں ملازمت ملنی چاہیئے۔ لڑکا لڑکی پڑھنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی سکول یا کالج انہیں داخل نہ کرے۔

یہ میں نے اپنی داستان خواہ مخواہ چھیڑ دی۔ آپ کی ہمت ہے کہ آپ نے سات سال گزار لئے ہیں۔ مجھ سے تو ایک سال بھی پورا نہیں گزر رہا۔

میرا ارادہ ہے کہ ان پر کچھ لکھوں۔ آپ کی کتاب نے اس ارادہ کو اور بھی تقویت پہنچائی ہے۔

کتاب کا دوبارہ شکریہ اور آپ نے میرا اور رخیسانی صاحب کا جو واقعہ لکھا ہے وہ آپ کی مرمتِ دوستانہ ہے۔ قائدِ اعظم کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بجائے خود ایک یادگار چیز ہے۔ میں بھی مختصراً کچھ لکھ رہا ہوں۔

آپ کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش ناکام رہی۔ چنانچہ یہ خط لکھا۔ خدا آپ کو مع متعلقین خیریت سے اور خوش رکھے۔

مخلص قدیم

شمشاد حسین

بخدمت گرامی جناب مجاہد حسین صاحب مشرف باد

محسن عزیز مسٹر خالد ام اسحاق کا سرٹیفکیٹ

Khalid M. Ishaque
128, Maneckji Street
Garden East
Karachi

Phones: Off. 73371
Res. 72116

June 20, '75

My dear Mujahid Sahib,

It was Justice Black, as far as I recall who once said that if a Lawyer fulfills a promise within 8 years of making it, it is early enough. So, please rejoice or join me rejoicing that I am fulfilling my promise to write a note about "Ruhoon Kay Rishtay" within a year or thereabouts.

Now, your Begum Sahiba's style of expression is simple, direct and non-professional. It is effective precisely for these qualities. It is pity there is not more of written material by her in this book. If she had lived longer, I have no doubt, the charm of her writing would have left a very notable mark in the literally circles. As far as your writing is concerned, I must confess that I find your style in Urdu singularly refreshing. I advisedly use the strong adjective 'singularly refreshing'. You would surely appreciate, what a happy change it is for a person who has had to suffer for decades your plausible writing of insufferable laws. But then, I must hasten to add that one must not be ungrateful. Afterall when I think of how Allah has chosen to provide me a living, it has been by constantly picking holes in what you produced (of course on behalf of the legislature) for the world of law. Another

Khalid M. Ishaque
[illegible]
KARACHI

..2..

refreshing aspect of your Urdu writing is that your usual bluntness comes out as pleasant sharp barbs and this I consider a quality that you share with some great ones of which the first one to come to my mind is Jonathan Swift.

Frankly, if you had had more time to yourself from legal drafting, I am quite sure, atleast the Urdu literature, in Pakistan, would have been far richer. It is never too late and as in Uganda you might not be getting too much practice of talking, I think if you keep writing it might be a very rewarding expenditure of time. Your book, "HUHOOQ KAY RISHTAY" is of course a very noble homage paid to licit love. As a book, it is unique as it contains such diverse material as to defy classification. Congratulations.

Yours sincerely,

(KHALID M.ISHAQUE)

بنامِ

جہاں دار جاں آفریں

پھُول کچھ......

خلشِ یادِ طرب، کیفِ سرورِ رفتہ،
کِس قدر لطف خموشیِ نواساز میں ہے

یہ ایک مختصر سا مجموعہ ہے* چند ایسے ڈرامے اور افسانوں کا جو میں نے اپنی مرحوم اہلیہ کے کاغذات میں سے چُنے ہیں، اور بعض ایسے واقعات کا جو میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔ آپ اسے معجونِ مرکب کہیں یا چوں چوں کا مُربّہ، مقصد یہ ہے کہ اُس کی کچھ باتیں یاد رہ جائیں، اور میری بھی۔ اِسے غالباً شوخیِ تحریر ہی کہنا پڑے گا کہ افسانے واقعات دکھائی دیتے ہیں اور اگر واقعات افسانے دکھائی دیں تو یہ ایک افسانہ نگار کے زیرِ اثر رہنے کا نتیجہ ہوگا!

اُس کی موت کو آج سات برس ہو گئے۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ وہ بیوی بہت خوش نصیب ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے سامنے مر جائے۔ گو میں نہ عورت ہوں نہ بیوی، لیکن مجھے اس قول سے اتفاق ہے۔ اگر میری بیوی میری طرح زندہ رہتی، اور میں اُس کی طرح مر جاتا، تو نہ معلوم اُس کا کیا حشر ہوتا۔ بہرحال، وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ــــ

* اس کی کوئی فہرس یا فہرستِ مضامین نہیں ہے۔

مرنے کا وقت مقرر ہے۔ پاپڑ بیلتے بیلتے یہ وقت آگیا۔ تھک کر چُور ہو چکا ہوں، وقت کم نظر آتا ہے، شاید کچھ اور نہ لکھ سکوں۔

اُس کی موت پر اعزا و اقربا نے تجہیز و تدفین میں آدھی رات تک جس خلوص سے ساتھ دیا، اس سے دل و دماغ آج تک متاثر ہیں۔ بھائی ہارون احمد صاحب نے لکھنؤ سے جو خط[1] بھیجا، وہ پیشِ خدمت ہے۔ اس سے مرحومہ کے بھائی کی زبانی اُس کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ حکیم سعید صاحب نے اپنی خاندانی روایات برقرار رکھتے ہوئے جس انداز میں ہمدردی فرمائی وہ اُن کے مراسلے[2] سے ظاہر ہے، جو دراصل اس نسخہ کا جزوِ اعظم ہے۔

بزرگوں اور دوستوں نے بھی ایسے وقت میں نہیں بھلایا، یہ اُن کا احسان ہے، ورنہ آجکل کون کس کو پوچھتا ہے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے لندن سے تار بھیجا، اور احمد جعفر صاحب، سید شریف الدین صاحب پیرزادہ، ایڈمرل یو۔ اے۔ سعید اور ایئر کموڈور تور دوچ نے کراچی سے خاص پیغامات ارسال فرمائے۔ مسٹر جسٹس قاضی محمد گل اور محمد صالح صاحب کے خطوط نے یہ ڈھارس بندھائی کہ وزارتِ قانون و پارلیمانی امور کے ساتھیوں میں بھی کوئی دلجوئی کرنے والا باقی تھا۔ سید علی رضا صاحب نے وزارتِ خارجہ سے جو تعزیتی پیغام بھیجا اُس سے وہ زمانہ یاد آگیا جب سر سید سلطان احمد صاحب مرحوم کی کوٹھی پر اُن سے ۱۹۴۲ء میں پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ لیڈی سلطان مرحومہ میری بیوی کو بیٹی کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ کیا زمانہ تھا، اب نہ لیڈی سلطان ہیں، نہ وہ —— رہے نام اللہ کا!

اَل اُفق، کراچی:

۲۱ مئی ۱۹۷۴ء

---

[1] صفحہ ۲۹ [2] صفحہ ۳۰

بھائی ہارون احمد صاحب کا خط :

[illegible]
7.6.67

۲۸۷

برادرم حاجی صاحب سلمہٗ ۔

کیا لکھوں اور کیسے لکھوں ۔ میرے تو ہوش و حواس درست نہیں ۔
ابھی کچھ روز ہوئے آپ کا لفافہ آیا تھا ۔ الحمد للہ اچھی ہو گئی تھیں ۔ یہ معلوم
نہ تھا کہ اس قدر جلد یہ معاملہ ہی سب ختم ہو جائے گا ۔ افسوس
صد افسوس ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ خلقی طور پر کمزور تھیں ۔
اور یہ بھی صحیح ہے کہ تمام عمر بیماریوں سے چین نہ پایا ۔ یہ بھی
حیرت ہے کہ اتنی عمر بھی کیسے پائی ۔ لیکن اگر خدا کی مرضی ہوتی
تو کیا عمر طبعی کو نہ پہنچ جاتی ۔ جانے والے چلے جاتے ہیں ۔۔۔
تو آرام میں ہیں ۔ مگر ان کے بعد دنیا میں زندہ رہنے والوں پر گذرتی ہے
وہ گذرتی ہے ۔ وہ تو سب بھائی بہنوں میں چھوٹی تھیں ۔ شکر اللہ میاں
کے کان چھڑانا تو بڑائی کا کیا خیال ۔ بچے ۔ بھی کچھ چھوٹے ہی گزرے
آگے بھی تو پیچھے بھی گئے ۔ اب بھی سب جا رہے ہیں ۔ اور چلے
جا رہے ہیں ۔۔ اب آپ کو بچوں کے لئے ماں اور باپ دونوں کا
بار اٹھانا ہوگا ۔ بیچاری ننھی آسیہ کا کیا حال ہوگا ۔ غازی کی
کیا حالت ہوگی ۔ چشتی تو شاید انگلینڈ میں ہوگا ۔ حالات ایسے ہیں
کہ دل کو سمجھا کر جی مسل کر رہ جاتا ہے ۔ یا اللہ تو ہی اپنا رحم فرما
سوچتا ہوں کہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا [illegible] مجبوری
اور لاچاری ہے ۔ زیادہ کیا لکھوں ۔ کچھ لکھا نہیں جاتا ۔ [illegible] ۔۔

الحاج حافظ حکیم محمد سعید صاحب کا مراسلہ:

حکیم محمد سعید
HAKIM MOHAMMED SAID
HAMDARD MANZIL
KARACHI (PAKISTAN)

[illegible]

عزیز گرامی [illegible]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم [illegible] کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر ملال کی خبر ملی۔ دلی صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [illegible] اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے [illegible] آپ کو صبر جمیل۔

آپ کا شریک غم

محمد سعید

ادارتی نوٹ

("اخبارِ خواتین" کراچی، مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۷ء)

طیبہ حسین سے میری کوئی ذاتی جان پہچان نہ تھی۔ اِس کے باوجود جب میں نے اُن کے انتقال کی خبر سُنی، تو یہی احساس ہوا، جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز ہستی مجھ سے جدا ہو گئی ہو۔
دراصل اُن کے افسانوں میں اتنا خلوص اور اتنی سچائی ہوتی تھی کہ انسان خود کو اُن کے بہید قریب محسوس کرنے لگتا تھا۔
مرحومہ (خدا اُنہیں اپنی رحمتوں سے نوازے) اخبارِ خواتین کے لئے گاہے گاہے لکھتی رہتی تھیں۔ اب ایک افسانہ اُن کے کاغذات سے مِلا ہے۔ اس پر ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔ اس کے مطالعے سے ان کی علمی بصیرت اور فنکارانہ ندرت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ یہ افسانہ اس شمارے کی زینت ہے۔ مرحومہ کے مختصر حالاتِ زندگی بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

(مُسرت جبیں)

۱۔ صفحہ ۳۷

۲۔ صفحہ ۳۳

صبیح مجاہد۔ مجاہد حسین اپنے بچوں کے ساتھ



(الیشیا کی پہلی سالگرہ پر: ۱۹۵۵ء)



خواتین کی فلاح

طلیبہ حسین کی زندگی کا بنیادی مقصد

طلیبہ حسین —— "بیگم صبیح مجاہد" —— ۱۹۱۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد منشی حبیب احمد علیشی، قصبہ سراوہ (تحصیل ہاپڑ) کی بڑی حویلی سے تعلق رکھتے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت میرٹھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ میرٹھ میں ان کا شمار فارسی اور اُردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ طلیبہ حسین نے دونوں زبانوں میں انہیں سے تعلیم حاصل کی۔ گھرانے کے رسم و رواج نے ان کو انگریزی سے دور رکھا۔

۱۹۳۴ء میں ان کی شادی مسٹر مجاہد حسین سے ہوئی۔ وہ میرٹھ کالج میں ایم اے، ایل ایل بی کے طالب علم تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر کالج چھوڑ کر امپیریل سکرٹریٹ میں کلرک ہو گئے تھے۔ ان کی اس وقت تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی ہمت افزائی کی۔ طلیعہ حسین کو خواتین کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ مرد اور عورت کو ہم پلہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ عورتوں میں ایسا شعور پیدا کرنے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی اور ذاتی محنت سے ۱۹۳۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا فارسی امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ پھر ۱۹۳۹ء میں انگریزی میں میٹرک پاس کیا۔ ان کا ارادہ کم از کم بی اے کرنے کا تھا لیکن صحت نے مزید امتحانوں کی تیاری کا موقع نہیں دیا۔

طلیعہ حسین کو، جو دِلّی اور شملہ کی خواتین میں "بیگم صبیح مجاہد" کے نام سے مشہور تھیں، تقریر اور تحریر دونوں سے دلچسپی تھی۔ اور دونوں کا موضوع خواتین کی فلاح و بہبود ہوتا تھا۔ انہوں نے خواتین کی محفلوں میں متعدد تقریریں کیں اور ان کو اپنی عظمت کا احساس دلانے کی بارہا کوشش کی۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے بھی چند مقالے نشر کئے لیکن کچھ اپنی صحت کی بنا پر اور کچھ اپنے موضوع کے انوکھے پن کے سبب یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکیں۔

قدرتی طور پر ان کو ادب اور سیاست دونوں سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ بچپن سے پیسہ اخبار، نیرنگِ خیال، عالمگیر، نگار اور دوسرے جریدے پڑھا کرتی تھیں اور اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کرتی تھیں۔ فارسی، اردو، انگریزی کا چیدہ چیدہ لٹریچر ان کی نظر سے گزرا۔ اسلام اور اسلامی تاریخ پر پورا عبور رکھتی تھیں۔ اور ہر مسئلہ پر پُر مغز بحث کر سکتی تھیں ان کو تقریریں سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اسمبلی میں قائدِ اعظم کی تقریر سننے کی خواہش ظاہر کی۔ قائدِ اعظم بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بیگم صبیح مجاہد کو اسمبلی آنے کی دعوت دی اور خصوصی دعوت نامہ بھجوا دیا۔ یہ دعوت نامہ آج

بھی ان کے کاغذات میں محفوظ ہے۔

ادب میں افسانے اور ڈرامے سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ہندوستان میں ان کے تین چار ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے اور بعض تو کئی کئی مرتبہ نشر کئے گئے۔ پاکستان میں ان کی صحت شروع ہی سے ایسی نہ تھی کہ ریڈیو یا کسی اخبار یا رسالہ کے لئے کچھ لکھ سکیں۔ پچھلے سال صحت بظاہر بہتر ہوتی دکھائی دی تو انہوں نے "اخبارِ خواتین" کے لئے افسانے لکھنے شروع کئے۔ ابھی تین افسانے بھی نہ لکھ سکی تھیں کہ صحت نے پھر جواب دے دیا۔

ان تمام مشاغل اور اس درجہ خراب صحت کے باوجود انہوں نے گھر بار سے کبھی بے توجہی نہیں برتی۔ قلیل آمدنی کے پیشِ نظر انہوں نے کئی سال تک چولھا ہنڈیا خود کیا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ان کے شوہر ملازمت میں ترقی کرتے گئے، یہ صعوبتیں کم ہوتی گئیں۔ تاہم بچوں کی پرورش، گھر کی دیکھ بھال، حساب کی جانچ پڑتال اور نوکروں کی نگرانی وہ خود کیا کرتی تھیں۔ انہی چیزوں نے ان کی صحت کو جو بچپن ہی سے تسلی بخش نہ تھی، خراب سے خراب تر کر دیا۔ اور باوجود انتہائی تگ و دو اور بہترین علاج معالجہ کے ۲۱ مئی ۱۹۶۷ء کو عصر کی اذان پر انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تین بچے، دو بیٹے اور ایک بیٹی، انہوں نے یادگار چھوڑے ہیں۔ بڑے بیٹے چشتی، کراچی یونیورسٹی کے گریجویٹ اور کیمبرج یونیورسٹی کے لاٹرائپوس ہیں، اور چھوٹے غازی بی اے کا امتحان دے رہے ہیں۔ ان کی بیٹی ایشیا گریمر سکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ان کے شوہر مسٹر مجاہد حسین کلرکی سے ترقی کرتے کرتے حکومتِ پاکستان کی وزارتِ قانون میں جائنٹ سیکرٹری کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے اور تیس سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۶۳ء میں ریٹائر ہو کر کراچی میں وکالت کرنے لگے۔ ان کی ترقی میں طیبہ کا بڑا دخل تھا جنھوں نے ہمیشہ ان کو زیادہ سے زیادہ محنت اور انتہائی دیانت داری کی ترغیب دی اور باوجود خرابیٔ صحت کے ان کا بچوں

کا اور سارے گھر کا پوری طرح خیال رکھا۔

ان کے کاغذات سے فی الحال ایک افسانہ کا مسودہ ملا ہے جو انہوں نے آخر اگست ۱۹۳۹ء میں شروع کیا تھا اور ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ختم ہوا۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۲ء کو انہوں نے اس پر نظر ثانی کی۔ اس سے ان کے شوق اور ان کی معذوریوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برسوں میں ایک افسانہ بھی مکمل نہ کر پاتی تھیں۔ ایک مختصر سے تنقیدی مقالہ کا مسودہ؎ بھی ملا ہے، جو انہوں نے عصمت دسمبر ۱۹۴۶ء کے کسی مضمون کے سلسلہ میں قلم بند کیا تھا۔ اس سے ان کی اس رائے کا پتہ چلتا ہے، جو وہ عورت اور مرد میں مساوات کے بارے میں رکھتی تھیں۔

؎ صفحہ ۱۰۱

رُوحوں کے رِشتے

(افسانہ جو مصنفہ کی موت کے بعد "اخبار خواتین" کراچی
مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا)

پہلے پہل سیمہ کو نیند زیادہ آنی شروع ہوئی جو ایسے زمانہ میں زیادہ آیا ہی کرتی ہے، اور پھر بُرے بُرے خواب دکھائی دینے لگے۔ اگرچہ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ چونکہ ایسی حالت میں معدے پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے اِس لئے نیند کا زیادہ آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں، مگر دہشت ناک خوابوں کی نوعیت کچھ اِس قدر سخت تھی کہ اسے اپنے گھر سے وحشت ہونے لگی اور اس نے اپنے شوہر پہ زور ڈالا کہ وہ اسے اُس کے میکے پہنچا دے۔ لیکن اس کے شوہر کی تمنا تھی کہ ہونے والے پہلوٹھی کے بچے کی صورت گھر میں جو سب سے پہلے دیکھے وہ اس کا باپ ہو، اس لئے اُس نے سیمہ کو بجائے میکے بھیجنے کے گھر بدلنا زیادہ مناسب سمجھا۔ سیمہ بھی اس خیال سے بہت خوش ہوئی اور اگلے ہی اتوار کو یہ لوگ دوسرے بنگلے میں منتقل ہو گئے۔

یہ بنگلہ سیمہ کے لئے اس قدر خوشگوار اور دلچسپ ثابت ہوا کہ وہ سرے سے دن کا سونا ہی بھول گئی اور دن میں نہ سونے کی وجہ سے رات کو ایسی گہری نیند سوتی کہ خواب تو خواب اس کو یہ بھی محسوس نہ ہوتا کہ کب سوئی اور کب اٹھی۔

موسم خوشگوار ہوتا جا رہا تھا، گرمیاں جا رہی تھیں اور سردی کی آمد آمد تھی، لُو نے

لطیف جھونکوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور اگرچہ اب کے برسات بہت کم ہوئی تھی مگر زمین اور درختوں پر اس کا کافی اثر تھا۔ نئے بنگلے کے عقبی باغ کے بیچوں بیچ سیب کا ایک گھنا درخت تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر سیمہ گھنٹوں اس بنگلے کو تکا کرتی جو باغ کے پرلی طرف اس کے بنگلے کے مقابل واقع تھا۔ بعض اوقات جب ننھی سی نہر میں جو باغ کے وسط میں ایک روپہلی لیس کی طرح پڑی ہوئی تھی، کشتیاں تیرانے، قسم قسم کے گلدستے بنانے، کیاریوں کو درست کرنے حتیٰ کہ سارے باغ کے دس دس چکر لگانے کے بعد بھی سیمہ کے رفیقِ حیات کے آنے میں ایک دو گھنٹے باقی رہ جاتے تو اس کی آرزو ہوتی کہ کاش یہ مقابل کا بنگلہ آباد ہوتا۔

اس کی یہ آرزو جلد ہی پوری ہو گئی۔ ایک چمکیلی دوپہر کو شوہر کے جانے کے بعد جب وہ باغ میں آئی تو اس نے بنگلے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھلے، اور کواڑوں کے شیشے جو ہمیشہ گرد سے اَٹے رہتے تھے، دھوپ میں شفاف پانی کی طرح جگمگاتے دیکھے۔

اب سیمہ کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا کہ فرصت کے لمحات جن کی تعداد اس کی بڑھتی ہوئی کمزوری کے سبب روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی تھی، سیب کے درخت کے نیچے بیٹھ کر یا ٹہل کر بنگلے کے اُن مکینوں کے نظارے میں صرف کرتی جو ایک پانچ سالہ بچے اور کئی نوکروں پر مشتمل تھے۔ گھر والی کو وہ اب تک نہیں دیکھ سکی تھی۔

ایک دن وہ نہر میں رنگین کاغذ کی ننھی ننھی کشتیاں تیرا رہی تھی کہ ننھا بچہ ایک بڑی سی گیند لئے اپنے برآمدے میں نمودار ہوا اور بڑی دلچسپی اور بے قراری سے یہ کھیل دیکھنے لگا۔ ہر بار جب ہوا اور پانی کے زور سے ہلکی پھلکی کشتی فراٹے بھرتی ہوئی دور نکل جاتی تو بچہ ایسی جھرجھریاں لیتا گویا بھاگتی ہوئی کشتی کو پکڑنے کے لئے بیتاب ہے۔ سیمہ کی بھی خواہش تھی کہ بچہ اس کے قریب آ جائے۔ لہٰذا کھیل کو اس نے زیادہ دلچسپ کر دیا اور بار بار محبت بھری نظروں سے بچے کو دیکھنے لگی۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ بچہ دوڑ کر نہر کے کنارے آ کھڑا ہوا اور ناچتی ہوئی کشتیوں کو پُرشوق نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس وقت سیمہ نے قریب

سے اچھی طرح اس بچے کو دیکھا جو حسن و صحت کی مکمل تصویر تھا۔ شربتی آنکھیں، گھنے اور گھنگریالے بال، اس کے تر و تازہ گول گول چہرے پر اس درجہ جاذبِ نظر تھے کہ کتنی دیر تک اس کی نظریں بچے کے چہرے سے نہ ہٹ سکیں۔

"ان میں سے کسی کشتی کو ڈبو سکتے ہو تو ڈبو لو۔" اس نے آہستہ سے مسکرا کر بچے سے کہا۔ بچے نے فوراً اپنی بڑی سی گیند کو تولا مگر دوسرے لمحے اس نے گیند ہٹالی اور زمین سے ایک پتھر اٹھا کر ایک لال رنگ کی کشتی پر تاک کر مارا۔ "غڑپ" کی آواز کے ساتھ کشتی پتھر سمیت تہ میں پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ننھا رُکا تالیاں بجاتا ہوا گھر کی طرف بھاگا۔ سیمہ بھی فوراً ہی نہر پھاند کر اس کے پیچھے لپکی اور گھر سے دس قدم کے فاصلہ پر اس نے بچے کو جالیا اور اپنے بازوؤں میں لے کر اپنی جگہ واپس آگئی۔

اس طرح جلد ہی حسین بچہ سیمہ سے کافی زیادہ مانوس ہو گیا اور اس کے کھانے کی الماری جو ہمیشہ قسم قسم کے چاکلیٹ، پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری رہتی تھی، ننھے جمی کے لئے وقف ہو گئی۔ اسی تقریب سے لڑکے کی ماں سے بھی اس کی ملاقات ہو گئی جو اچھی خاصی حسین، مہذب اور شریف عورت تھی۔

سورج پر زردی آنے والی تھی جب سیمہ کئی گھنٹے اپنی ایک سہیلی کے یہاں گزار کر واپس آئی۔ ننھا جمی حسبِ معمول اس کے ساتھ تھا۔ جمی کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے وقت کسی کو برآمدے میں کھڑا ہوا محسوس کر کے ایک دم سیمہ کی نظریں اوپر اٹھیں اور حیرت سے جمی کی جمی رہ گئیں۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ کس طرح ننھا جمی ایک دم ستائیس اٹھائیس سال کا مرد بن کر برآمدے میں آکھڑا ہوا۔ دوسرے لمحے اسے ہوش آیا، ننھا جمی اب تک اس کی انگلی پکڑے اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اپنی حماقت اور اس اجنبی شخص کی نظروں سے پسینہ پسینہ ہو کر سیمہ نے جمی کی انگلی چھوڑ دی اور تیز تیز قدموں سے اپنے بنگلے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے پردے کی اوٹ سے دیکھا، مرد کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور ننھا جمی اس کی ٹانگوں سے لپٹا باتوں میں مصروف تھا۔ سیمہ لیکن

سے کرُسی پر گر گئی اور سوچنے لگی "اِس قدر ہم شکل باپ بیٹے" !

سیمہ کی حالت اب روز بروز نازک ہوتی جارہی تھی۔ وہ اب نہ تو شام کو گھومنے جاسکتی تھی، نہ بیڈمنٹن کھیل سکتی تھی۔ سینما میں دو ڈھائی گھنٹے جم کر بیٹھنا اس کے لئے دشوار تھا۔ شطرنج اُسے آتی نہ تھی، اور برج بغیر چار آدمیوں کے کھیلی نہیں جاسکتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس کے شوہر کے شام کے لمحات کچھ بے لطف کٹ رہے تھے! اور وہ اس کو بُری طرح محسوس کرتی تھی۔ آخر ایک دن اُس نے بڑے سوچ بچار کے بعد اپنے شوہر سے کہا کہ برج تو تین آدمیوں میں بھی ہوسکتی ہے کیوں نہ جمی کی ماں کو گانٹھا جائے۔ اُس کا شوہر ایک دم خوشی سے اچھل پڑا۔

"خوب یاد دلایا!" اس نے تیزی سے کہا "لیکن اگر جمی کی ماں کو گانٹھا جاسکتا ہے تو اُس کے باپ نے کیا خطا کی ہے؟ کیوں نہ برج کا پورا لطف اٹھایا جائے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے" سیمہ کچھ سوچ کر بولی، "مگر......

"مگر کیا؟" اس کے شوہر نے بات کاٹی۔

"مگر یہ کہ ایسی حالت میں کسی کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے!"

"لغو" —— اس کے شوہر نے اپنے لہجہ میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا اور اسے صوفے پر بٹھا کر اس کے گرد خوب اچھی طرح سے شال لپیٹ دی۔ "اب تو ٹھیک ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا خاک ٹھیک ہے!" وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔

"کوئی پرواہ نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے نوکر کو آواز دی اور جمی کے ماں باپ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ پانچ منٹ بعد آگے آگے اچھلتا کودتا جمی اور اس کے پیچھے دونوں میاں بیوی کمرے میں داخل ہوئے۔ جمی آتے ہی سیمہ سے لپٹ گیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ تاش کا سنہری کیس اسے کھیلنے کے لئے دے دیا جائے۔ اِس ہاتھا پائی اور ضد میں سیمہ کو سلام وغیرہ کا بھی ہوش نہ رہا اور جب وہ کیس خالی کرکے جمی کو دے کر ادھر متوجہ ہوئی تو وہ لوگ بیٹھ چکے تھے۔ اس نے دیکھا کہ جمی کے باپ کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں یا شاید اپنے بیٹے پر جواب تک سیمہ کے گھٹنے پر سوار تھا۔ سیمہ کا شوہر اس کے برابر پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ

میاں بیوی مقابل ہیں، کیونکہ جمی کی ماں اور سیمہ پارٹنر تھیں۔ کھیل عورتوں کے لئے کافی پر لطف رہا کیونکہ جمی کے باپ کی مسلسل غلطیوں نے انہیں جتوا دیا۔ حالانکہ اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ کلب میں بہترین کھیلنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ تفریح کا پروگرام بھی کچھ دیر نہ چل سکا۔ کیونکہ اگلے ہی دن صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے سیمہ کا سورج طلوع ہو گیا یعنی ایک گول مٹول لڑکی۔ لڑکی اتنی موٹی اور بھدی سی تھی کہ جب نرس نے نہلا دھلا کر اُس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سیمہ کے شوہر کو دکھایا تو سیمہ نے منہ بنا کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے منہ سے ایک دم نکل گیا: "لڑکی اور وہ بھی اتنی بدنما۔"

"بدنما!" لیڈی ڈاکٹر نے جو کمرے کے پرلے کونے میں کچھ شیشیوں کو اُلٹ پلٹ رہی تھی حیرت سے اُس کے لفظ دہرائے۔ "آپ اس کو بدنما کہتی ہیں؟" اور اس نے بچی کے قریب آ کر کہا: "یہ تو اتنی حسین ہوگی کہ آپ کو بھی مات کر دے گی۔"

واقعی لیڈی ڈاکٹر کا کہنا درست نکلا۔ کیونکہ چالیس دن کے اندر اندر سیمہ کی پیاری بچی نے اپنی ہیئت کذائی بالکل تبدیل کر دی۔ اس کا بھدا پن اور سوجن جو غالباً ایک فربہ بچے پر ابتدائی حالت میں ضروری ہے، بالکل جاتا رہا اور وہ ایک گول برف کی طرح سفید اور نہایت تیکھے نقش کی بچی نکل آئی جس پر اپنے تو اپنے غیروں تک کو پیار آتا تھا۔ بالوں کے رنگ، اور پیشانی وغیرہ کے لحاظ سے وہ اپنے باپ سے مشابہ تھی مگر سیمہ کے شوہر کا خیال تھا کہ وہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ آنکھیں تو گویا قدرت نے چار ہی بنائی تھیں، جن میں سے دو سیمہ کو دے دی تھیں اور دو اب اِس بچی کو اور یہی سیمہ کے حسین چہرے کا مول تھیں۔

سردی روز بروز بڑھ رہی تھی، اس لئے سیمہ اکثر دوپہر کے وقت سامنے کے برآمدے میں جس میں خوب دھوپ آتی تھی، جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ جمی تو زیادہ تر رہتا ہی اُس کے پاس تھا۔ کبھی کبھی اُس کی ماں بھی آ جاتی تھی اور چند لمحے کو رونق بڑھ جاتی تھی۔

حسبِ معمول ایک دوپہر کو وہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تازہ اخبار دیکھ رہی تھی، جمی سامنے باغ میں کھیل رہا تھا اور آیا روتی ہوئی بچی کو ٹہل ٹہل کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی

تھی۔ ایک دم وہ جمی کے باپ کی آواز پر چونک پڑی، جو برآمدے میں کھڑا اپنے بیٹے کو بلا رہا تھا۔ جمی اس وقت ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اس لئے اس نے آواز کی پرواہ نہ کی۔ اس پر اس کا باپ برآمدہ عبور کر کے باغیچے میں آ گیا۔ وہاں آیا بچی کو لئے ٹہل رہی تھی۔ اس نے بچی پر ایک نظر ڈالی اور پھر چہرے سے کپڑا ہٹا کر صورت دیکھی اور فوراً ہی نہایت شوق سے اُسے اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔

بچی اس قدر خوبصورت اور پیاری تھی کہ کسی کا اس کو گود میں لینا اور پیار کرنا تعجب انگیز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن دھندلی دھندلی جو نگاہیں جمی کے باپ نے بچی پر ڈالیں، ان کی تشریح کوئی قلم نہیں کر سکتا، نہ زبان بیان کر سکتی ہے۔ نہ جانے کیوں سیمہ اس منظر کو نہ دیکھ سکی، پھر اخبار اس کے آگے چھا گیا۔

دن گزرتے رہے، ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گزرتے چلے گئے یہاں تک کہ ننھی نینہ گھٹنوں چلنے لگی اور پھر جلد ہی اس نے ایک رنگین تتلی کی طرح سارے باغ میں دوڑنا شروع کر دیا۔ کچھ تو بنگلے کی عمدہ جائے وقوع، کچھ ماحول کی خوشگواری اور ان سب کے علاوہ بہترین پڑوس، ان سب نے مل کر ایسی پر سکون فضا قائم کر دی کہ اپنے پرانے گھر میں جانے تک کا خیال میاں بیوی کے دماغ سے محو ہو گیا۔ سیمہ کے لئے اس کی بچی ہی کیا کم کھلونا تھی، اس پر جمی کی شوخیاں، پیاری پیاری باتیں اور جمی کی ماں جیسی شریف اور مہذب ہمجولی کا ساتھ! مگر یہ خوشگوار ماحول زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

شام کے چھ بج چکے تھے جبکہ سیمہ اپنے شوہر کا انتظار کر کے چائے کی میز پر گئی، بغیر اپنے رفیقِ حیات کے اس کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، مگر چونکہ ننھی نینہ بھوک سے بیتاب تھی اس لئے مجبوری تھی۔ وہ ابھی پوری طرح پیالیوں میں چائے بھی نہ بنا پائی تھی کہ بیرے نے ایک نیلا لفافہ لا کر اس کو دیا۔ لفافے پر اس کا نام اور پتہ درج تھا۔ شوہر کی واپسی میں دیر ہونے کی وجہ سے اس کا دل گھبرایا ہوا تھا۔ یہ لفافہ دیکھ کر تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے بڑی بے قراری سے لفافہ کھول کر خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ پہلے تو اس پر حیرت طاری ہو گئی،

پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔ آخر کار جھنجلا کر اس نے خط میز کی دوسری جانب پھینک دیا۔ یہ خط مجی کے باپ کا تھا' بڑی مختصر سی تحریر تھی اور اس نے لکھا تھا کہ مجی کی نسبت نینہ سے طے کر دی جائے۔ سیمہ اس حماقت اور بے وقت کی راگنی پر ہنستی اور جھنجلاتی نہ تو کیا کرتی۔

آٹھ بجے تک وہ شوہر کا انتظار کرتی رہی اور مسلسل اس خط کے بارے میں سوچتی رہی کہ آخر یہ کس جذبہ کا نتیجہ ہے۔ شوہر کی آمد پر اس نے خط اسے دکھایا۔ اس نے مردانہ سنجیدگی سے سوچ کر رائے قائم کی کہ یہ خط کسی دماغی دورے کا نتیجہ ہے اور اس کا جواب دینا خود کو دماغی دورے میں مبتلا کر لینا ہے۔ اس حد تک وہ اپنے شوہر سے متفق تھی کہ یہ خط لکھنے والا دماغی صحت سے عاری ہے، لیکن جواب دینا ضروری سمجھتی تھی۔ اس لئے اس نے شوہر سے مشورہ کر کے جواب لکھ دیا کہ یہ وقت اس قضیہ کے لئے درست نہیں ہے' نہ ہماری آپ کی کوشش اس سلسلے میں بار آور ثابت ہو سکتی ہے۔ صرف وقت ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ بیسویں صدی ہے اور اب وہ زمانہ نہیں رہا جب کہ اکثر پیدائش سے پیشتر ہی بچوں کی قسمت کے فیصلے والدین کی بارگاہ سے صادر ہو جایا کرتے تھے۔

اس کے ایک ہفتے بعد جب کہ اس کا شوہر طویل دورے پر شہر سے باہر گیا ہوا تھا' ایک خاموش دوپہر کو مجی کے باپ کی ملاقات کی خواہش نے اسے سٹپٹا دیا۔ بےشک وہ اس کا ہمسایہ تھا اور ان کی ملاقاتیں بھی اکثر ہوتی رہتی تھیں، مگر اول تو تنہائی میں، دوسرے اس کے اس اوٹ پٹانگ خط اور پھر چاندنی راتوں میں دیوانہ وار باغ میں ٹہلتے رہنے کی عادت نے سیمہ کو کچھ دہشت زدہ سا کر دیا تھا، مگر قہر درویش بجان درویش۔ انکار مناسب نہ تھا۔ گرم اور خاموش دوپہر کی دہشت بڑھتی جا رہی تھی، کھڑکیوں پر کھجور کے لمبے لمبے سائے بھوتوں کی طرح تھرک رہے تھے۔ ننھی نینہ کھیلتے کھیلتے صوفے پر ہی سو گئی تھی اور سیمہ اس کو تھپک رہی تھی۔ اس نے بچی کی کمر سے ہاتھ اٹھائے بغیر خود کھڑے ہو کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے ہاتھ میں سیمہ کا خط تھا بغیر لفافے کے۔ سیمہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر پھر بھی اسے ایسا محسوس

ہو رہا تھا کہ مقابل کی خاموش اور گہری نظریں آنکھوں کے پردوں کو چیر کر اس کے دِل میں گھُسی جا رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو زحمت سے بچانے کے لئے تحریر کا ذریعہ نکالا تھا مگر آپ کے بے رحم جواب نے مجھے اِس تکلیف دہی پر مجبور کر دیا۔" جمی کے باپ نے بدقت یہ الفاظ ادا کئے۔ نہ معلوم کیوں اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ایک تو اس کی آواز، پھر اس کا وہ خط اور ان سب پر مستزاد اس کی وحشی آنکھیں اور بکھرے بال، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے واقعی اس کا دماغی توازن بگڑا ہوا ہو۔ وہ اس قسم کی گفتگو کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"میں تسلیم کرتی ہوں کہ میرے جواب میں خامیاں ہوں گی۔ کیونکہ، معاف کیجئے گا میرا ناقص دماغ آپ کے خط کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔"

ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ جمی کے باپ کے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی:

"بیشک، آپ نہیں سمجھ سکتیں"۔ الفاظ جیسے اس کے ہونٹوں سے خود بخود پھسل پڑے تھے۔

"آپ سمجھائیں تو شاید سمجھ سکوں، ورنہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایسی خواہش کا اظہار ایک تعلیم یافتہ اور صحیح الدماغ انسان کی طرف سے، کسی کو حیرت زدہ ہی کر سکتا ہے۔" سیمہ نے جواب دیا۔

"تو گویا اپنی اولاد کی زندگی سنوارنا پاگل پن ہے۔ کون ہے جو اپنی اولاد کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں نہیں ہوتا۔ کیا آپ خود اپنی نینہ کی زندگی کو پُر مسرت بنانے کے لئے ہر قربانی دینے پر تیار نہیں ہیں؟"

سیمہ اس کا کیا جواب دیتی۔ جل بھُن کر بولی: "گویا دو سال کی ایک ننھی سی بچی سے جو صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہو، آپ کے ننھے سے لڑکے کا مقدر باندھ دینا آپ کے نزدیک اپنی اولاد کا شاندار مستقبل تعمیر کرنا ہے۔"

سیمہ کے ان الفاظ سے اس کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز تبسم نمودار ہوا۔ اس نے ایک نظر سیمہ کے

چہرے پر ڈالی اور روشنی کی ایک جھپکی سی اس کی چوڑی چوڑی پتلیوں تک آکر واپس ہو گئی۔

سیمہ اس کے جواب کی منتظر تھی، مگر وہ خاموش تھا۔ اِس طرح خاموش جیسے اب بولنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو۔ سیمہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ بیٹھنے سے گھبرا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ جتنی دیر لگے اچھا ہے، مگر اسے تو اس بے معنی ملاقات سے الجھن ہونا ہی تھی۔ آخر اُس کو گھر میں اور سینکڑوں کام تھے۔ اِس لئے اُس نے کہا:

"اگر میں غلطی پر ہوں اور اسے ثابت کرنے کے لئے آپ کے پاس کچھ دلیلیں ہیں تو براہِ مہربانی ان کو کہہ ڈالئے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کے بعد میری ناقص عقل جو فیصلہ کرے گی، میں ایمانداری کے ساتھ آپ کو مطلع کر دوں گی۔"

"بہتر یہ ہے کہ آپ دلائل سُنے بغیر درخواست مان لیں، آپ یہی سمجھ لیجئے گا کہ آپ نے ایک بھکاری کو بھیک دی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ سیمہ محسوس کر چکی تھی، یہ خواہش نرا پاگل پن ہی نہیں، اس کے پیچھے کوئی اہم راز پنہاں ہے۔ اس نے کہا:

"فرض کیجئے کہ اس وقت میں یہ بات مان بھی لوں تو میرے نزدیک اس کی معقولیت پھر بھی مشتبہ رہے گی۔ اِس لئے ممکن ہے کہ میں زیادہ عرصہ اس پر قائم نہ رہ سکوں۔"

اس نے بے چارگی سے ملتجی نظروں سے سیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ سیمہ کی بات کا قائل ہو چکا تھا، مگر سیمہ دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ اس کے سینے میں ہے، ہونٹ اُسے ادا کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ البتہ اس کی آنکھیں اظہار کا فرض بخوبی انجام دے رہی تھیں، لیکن چونکہ مقابل پتھر سے زیادہ سخت تھا اس لئے یہ نازک تیر بالکل بیکار تھے۔

"اکثر اوقات دنیا میں ایک روح دوسری روح کی پرستش کے لئے تخلیق کی جاتی ہے، اور ایسی روح، جیسا کہ آپ کو علم ہے، اپنے آخری لمحات تک اس فرض کو انجام دیتی ہے، اور اپنے بعد عشق کی ایک دِل گداز لافانی کہانی چھوڑ جاتی ہے، مگر کبھی کبھی قدرت اس سے زیادہ المناک کھیل کھیلتی ہے، یعنی معبود روح پرستار روح سے ابتدا میں پوشیدہ رہتی ہے اور پھر یکایک اس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ پرستار روح کو مادی زندگی کے بندھن اچھی طرح جکڑ چکے ہوتے ہیں۔ پھر اس جذبۂ پرستش اور ان سخت بندھنوں کی کشاکش غریب رُوح کو آدھ مُوا

کر کے دین و دنیا دونوں سے بیزار کر دیتی ہے" اتنا کہہ کر اس نے سر اُٹھا کر سیمہ کو دیکھا جس کی شفاف پیشانی شکنوں سے پُر تھی اور تیکھی نظریں اُسے گھور رہی تھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اِس روشن الوہیت نے جو اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی سیمہ کے غصّے کے اُن شعلوں کو جو اس کی اس لایعنی گفتگو کی پیداوار تھے بجھا کر رکھ دیا۔ وہ بڑی حد تک اس کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ مگر اس کی تفصیل اس کی زبانی سننے کے لئے نظریں جھکائے خاموش اور متوجہ بیٹھی رہی، پھر وہ کہنے لگا:

"کیا یہ باپ کا فرض نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو اس ہولناک کشاکش اور اذیت سے بچانے کے لئے اپنی عزت اور خودداری تک کو بھینٹ چڑھا دے۔ بے شک آپ کہہ سکتی ہیں کہ یہ کیا فرض ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی محبوبہ کی بیٹی سے محبت کرے۔ ہاں یہ لازمی نہیں، لیکن کیا آپ اس سے انکار کریں گی کہ اگر ایک جگہ حروف "ا۔ ب" کی ترکیب سے "اب" بنتا ہے تو دوسری جگہ بھی اسی ترکیب سے یہی لفظ بنے گا۔ پھر جو تعلق حروف و معنی میں ہے، کیا وہی رُوح اور جسم میں نہیں؟ کیا آپ جمی کو ــــــ معصوم اور غریب جمی کو دانستہ اس بھیانک غار میں پھینک دینا پسند کریں گی جس میں نادانستہ مجھے پھینک چکی ہیں؟" یہ کہتے کہتے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا، اور ایک دم آگے بڑھا۔ سیمہ اس کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے خوف زدہ سی ہو گئی اور ایک عجیب گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکل گیا:

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے سامنے ایک شادی شدہ عورت ہے؟ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جب میرے شوہر کو اس ملاقات کی تفصیل معلوم ہو گی تو آپ کی کیا پوزیشن ہو گی؟"

دوسرے لمحے جمی کے باپ کا سر سیمہ کے قدموں پر تھا۔ سیمہ کی حالت اس وقت انتہائی قابلِ رحم تھی۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی زیادتی سے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ ہاتھوں سے وہ اس کا سر اٹھانا نہ چاہتی تھی اور زبانی کہنے کا اس پر اثر نہیں تھا۔ سیمہ کے پَیر اس کے گرم گرم آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ وہ اس سے سر اٹھانے کے لئے کہہ رہی تھی، مگر وہ ایک مدہوش شرابی کی طرح ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ یہ راز جو ایک سینہ سے دو سینوں میں بٹ چکا ہے، کسی تیسرے سینہ میں منتقل نہ ہو۔ سیمہ کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ یہ وعدہ کرے

کیونکہ وہ جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے یقین دلایا کہ اس کا کمزور سینہ ایک آہنی صندوق سے بھی زیادہ سختی سے اس انوکھے اور دردناک راز کی حفاظت کرے گا۔

اس وعدہ کے بعد وہ چلا گیا۔ بغیر ایک لفظ بولے۔ خاموشی اور اداسی سے۔ بالکل ایک مُردے کی طرح۔ حد ہے کہ اس وعدے پر شکریہ کا ایک بھی لفظ ادا نہ کیا۔ بے شک سیمہ کے تیکھے اور روکھے تیور اس کو موت کی وادیوں میں غرق کر چکے تھے۔ وہ حیران اور ساکن نظروں سے اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ اُس وقت تک جب تک کہ سیب کے گھنے درخت کے سائے نے اس کو نظروں سے بالکل اوجھل نہ کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی سیمہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ روتی رہی، لگاتار کئی گھنٹوں تک۔ یہاں تک کہ نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ کبھی بھی یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کے یہ لاتعداد آنسو کس لئے تھے۔

چونکہ سیمہ وعدہ کر چکی تھی اور وعدہ بھی کس سے، ایک ناکام، بدقسمت اور بدنصیب نوجوان سے، اُس نے اِس ملاقات کا حال شوہر سے بیان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر اس جرم کا کفارہ اس نے اِس طرح ادا کیا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر مکان تبدیل کر دیا۔

پانی سے زیادہ تیز بہنے والا زمانہ گزرتا رہا، اپنی پوری رفتار سے یہاں تک کہ اس واقعہ کو پندرہ سال ہو گئے۔ پورے پندرہ سال۔ اس طویل عرصہ میں کبھی کبھی رات کی خاموشی میں یا دن کی تنہائی میں دو پھٹی ہوئی آنکھوں، گھٹی ہوئی سانس اور ہچکیوں کا تصور سیمہ کو ایک لمحہ کو اُداس کر دیتا۔

اس کی اکلوتی اور لاڈلی بچی نینہ حسبِ دستور گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج سے اس کے پاس آئی ہوئی تھی۔ مگر اِس مرتبہ خلافِ معمول اس کے انداز بدلے ہوئے تھے۔ اس کی شوخی اور چلبلا پن غائب تھا اور وہ مسرت جو ماں کے پاس رہنے سے اس کے تمام سراپا پر بکھری نظر آتی تھی، وہ یکسر غائب تھی۔ سیمہ اس کی اِس حالت کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ مگر نہ تو وہ خود کچھ سمجھ سکتی تھی اور نہ کچھ اس سے پوچھ سکتی تھی۔ بعض اوقات وہ سوچتی کہ کیا یہ صرف میرا وہم ہے؟

چائے کی میز پر کئی آوازیں دینے کے بعد بھی جب نینہ نے کوئی جواب نہ دیا تو مجبوراً سیمہ اُٹھ کر اس کے کمرے میں آ گئی۔ مگر وہ جھجک کر کمرے کے دروازے پر ہی رُک گئی۔ کیونکہ نینہ نے جو اپنی لکھنے کی میز کے قریب کھڑی تھی، اس کی آہٹ پا کر اُس فوٹو کو جو اُس کے ہاتھ میں تھا، اس گھبراہٹ اور عجلت سے اپنے اٹیچی کیس میں چھپایا کہ سیمہ تو سیمہ ایک پاگل سے پاگل شخص بھی مشکوک ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا، اور اس طرح گویا اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس کے بہرے پن پر ملامت کرتی ہوئی واپس ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ سیمہ کے دل میں ایک ایسی ناقابلِ بیان خلش ہو رہی تھی جس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کی اولاد جوانی دیوانی کے دَور سے گزر رہی ہو۔ اور یہ چند گھنٹے جو نینہ کی ہواخوری کے لئے جانے میں باقی تھے، اس کے لئے گزارنا دشوار ہو رہے تھے۔ اس کے بعد جونہی نینہ دروازے سے باہر ہوئی، اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ مضطربانہ نینہ کے کمرے میں گھس گئی۔ اور اُس کے تکیئے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا لے کر اٹیچی کیس کھول ڈالا۔ کیا اس کی یہ حرکت مجرمانہ تھی؟ نہیں ہرگز نہیں، ماں ہونے کی حیثیت سے اُسے کامل حق حاصل تھا کہ وہ اپنی اولاد کے افعال کی پوری نگہداشت کرے۔ اٹیچی کیس کھلا تو سب سے اُوپر وہی فوٹو اوندھا رکھا ہوا تھا۔ سیمہ نے تیزی سے اُس کو اٹھا لیا، لیکن نجانے کیوں فوٹو اس کے ہاتھ میں قائم نہ رہ سکا اور نیچے گر پڑا! اور وہ خود چکرائی ہوئی سر کو تھامے نینہ کے پلنگ سے ٹِک گئی جو قریب ہی بچھا ہوا تھا۔ فوٹو بھی کے باپ کا تھا۔ غالباً اس سے کچھ پہلے کا جب سیمہ نے اس کو دیکھا تھا۔ یقیناً اس نے ان آنکھوں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی جن کو اس کی ایک جھلک نے ہمیشہ کے لئے افسردگی کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیا تھا۔

وہ نہ جانے کب تک وہاں بیٹھی رہی۔ ماضی کے اُس المیہ نے اِس کے دماغ کو اِس قدر مصروف کر لیا کہ اُسے یہ سوچنے کا بھی ہوش نہ رہا کہ یہ فوٹو نینہ کے پاس کیسے آیا اور کیوں؟ اور یقیناً اس ڈرامے کا، جو اس کی آنکھوں کے سامنے کھیلا جا رہا تھا کبھی ڈراپ سین نہ ہوتا، اگر غریب نینہ کی ایک نہایت خفیف اور گھٹی ہوئی خوفزدہ چیخ اور تیز تنفس اسے اپنی طرف

متوجہ نہ کر لیتا۔ نینہ کو دیکھ کر اس نے بڑی دشواری اور ہوشیاری سے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے فوٹو کو میز پر سیدھا رکھ کر سوالیہ نگاہیں اپنی بیٹی کے چہرے پر جما دیں۔

خوف اور ندامت سے نینہ کی نظریں زمین میں گڑی جا رہی تھیں اور اُس کی سفید پیشانی پر پسینے کے موتی جھلک رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کی حالت سے بے خبر کسی سخت سلوک کی منتظر تھی۔ کتنی ہی دیر تک ایک ہیبت ناک خاموشی کمرے پر چھائی رہی جسے آخر کار سیمہ کے ان الفاظ نے توڑا،

"نینہ، بیٹی چپ کیوں ہو، بتاؤ نا، کون ہے یہ؟"

نینہ نے التجا آمیز نظریں اپنی ماں پر ڈالیں۔ جیسے اپنی جوانی کی اِس تقصیر پر اسے اپنا شفیع بنا رہی ہو اور پھر گردن جھکالی۔

"میں یہ نہیں پوچھ رہی کہ یہ فوٹو تمہارے پاس کیوں ہے یا کیسے آیا۔ تمہاری ماں اتنی بے وقوف نہیں۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ یہ ہے کون؟" آخری الفاظ پر سیمہ کی زبان لڑکھڑائی، مگر اُس نے مادرانہ وقار اپنے لہجہ میں کم نہ ہونے دیا۔

"کالج کا ایک طالب علم" نینہ نے بالآخر دھیمے سے جواب دیا۔

"ہوں ۔۔! یہ تو ظاہر ہے" سیمہ نے اس لمبی سی "ہوں" میں عجیب سا رُعب پیدا کرکے کہا: "مگر اس کا نام کیا ہے؟"

"رجمی" اتنا کہہ کر نینہ ایک دم سیمہ کے پاس بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر ٹکا کر معصوم اور خوشامدانہ انداز میں کہنے لگی:

"امی! مجھے معاف کر دیجئے۔ بے شک مجھے آپ کی نصیحت یاد تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی کسی کی باتوں پر توجہ نہیں دی، مگر امی! اس کا شریفانہ انداز، اس کی معصوم محبت بھری نظریں، اور سب سے بڑھ کر اس کی پُرخلوص خاموشی اور والہانہ محبت ـــــ پرستش ـــــ"

نینہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ جلد ہی اس مدہوشی سے چونک پڑی جو رجمی کے نام نے اس پر طاری کر دی تھی۔ اس کو احساس ہو گیا کہ وہ اپنی ماں سے مخاطب ہے۔

سیمہ کو قائل کر دینے کے لئے یہ بہت کافی تھا مگر ظالم سیمہ ـــــ ایک ننھا سا خیال

بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا ــــ بلاشبہ اپنی فتح کے لئے اس محبت کے کھیل میں جمی کے باپ کو دخل ہے اور پھر اس خیال کے آتے ہی یہ سوال بھی اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا،

"تم اس لڑکے کے باپ کو جانتی ہو؟"

"نہیں امی! وہ تو ہے ہی نہیں"، حیرت زدہ نینہ نے ماں کو تکتے ہوئے کہا۔

"کہاں گیا؟" سیمہ کی آواز چیخ کے مشابہ تھی۔

"مر گیا ٹپ دق کی بے انتہا مصیبتیں جھیل کر۔"

"کب؟" سیمہ پاگلوں کی طرح چلائی۔

"اس سے پہلے کہ جمی کو یہ تمیز ہو سکتی کہ باپ کتنی بڑی نعمت ہے" نینہ نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ سیمہ کے مجنونانہ انداز نے اس کو تعجب اور خوف سے زرد کر دیا تھا۔

سیمہ کا سر بے ساختہ فوٹو پر جھک گیا، اور اُس کے بے قرار آنسوؤں نے جمی کے چہرے کو، جسے وہ جمی کے باپ کے علاوہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھی اُڈھانپ لیا۔

غریب نینہ کبھی بھی نہ سمجھ سکی کہ اُس کی ماں کے یہ آنسو کس کے لئے تھے۔



کچھ پسماندے کے متعلق

(قوم دوستی کی کہانیاں — پرویز شیخ صاحب
نے اس فیچر کے تحت لکھا اور "مشرق" کراچی کے
سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا)

بہت سے انسان بہت سی تمناؤں کو مقصدِ حیات قرار دے کر آخر وقت تک فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس خواہش کو دوسری خواہشات پر ترجیح دیں نتیجتاً ناکامی اور مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بہت کم لوگ ہیں جو بہت کم خواہشات کو اپنا آئیڈیل بناتے ہیں اور مسلسل جدوجہد سے سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ وزارتِ قانون کے سابق ڈرافٹسمین اور جائنٹ سیکرٹری مجاہد حسین بھی یقیناً ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ

اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو دو ہزار تین سو روپے تنخواہ پا رہے تھے، لیکن ۱۹۳۳ء میں جب انہوں نے کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا تو اُن کی تنخواہ صرف ساٹھ روپے تھی۔

مُجاہد حُسین صاحب متوسط گھرانے کے فرد ہیں۔۱۹۱۰ء میں جے پور میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن کا ابتدائی دَور لائل پور میں بسر ہوا، جہاں ان کے والد شیخ اعجاز حُسین، زراعتی فارم کے پہلے منیجر تھے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مُجاہد حُسین صاحب کے والد نے مستقل طور پر جے پور میں سکونت اختیار کرلی، جہاں انہوں نے انٹر تک تعلیم پائی اور مزید تعلیم کے لئے میرٹھ چلے آئے۔

یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ مُجاہد حُسین کی زندگی کا یہ دَور بڑا فیصلہ کُن تھا۔ لمبے چوڑے پروگرام تو انہوں نے کبھی بنائے نہیں تھے۔ بس زندگی میں دو چیزوں کی خواہش تھی۔ ایک تو بچپن کی منگیتر سے شادی اور دوسرے وکیل بننا۔ ۱۹۳۲ء میں بی اے کرنے کے ساتھ ہی شادی کی تمنا تو پوری ہوگئی، لیکن وکیل نہ بن سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی شادی کے لئے سرکاری ملازمت کی شرط عائد کردی گئی تھی۔ اس موقع پر ان کی دونوں تمنائیں آپس میں ٹکرانے لگیں، اور ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ کس خواہش کو دوسری پر فوقیت دیں۔ میرٹھ کالج میں اس وقت وہ بیک وقت ایم اے، اور ایل ایل بی میں داخلہ لے چکے تھے۔ اپنی زندگی کے اس اہم ترین مسئلے پر نوجوان مُجاہد حُسین نے کچھ زیادہ غور نہیں کیا اور جھٹ سرکاری ملازمت کر کے شادی کر ڈالی۔ ممکن ہے ان کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی رہا ہو کہ شادی کے بعد وہ اپنی دوسری تمنا بھی پوری کرلیں گے۔

وہ لوئر ڈویژن کلرک تھے اور تنخواہ صرف ساٹھ روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ اب مُجاہد حُسین صاحب کے سامنے صرف دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ ساری عمر کلرک

کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔ دوسرا راستہ ان کی اُس منزل کی نشان دہی کر رہا تھا جو بچپن سے ان کی بے چین طبیعت کا حصہ رہا تھا۔ پھر خوش قسمتی سے "صُبیح مُجاہد" کی صورت میں انہیں بیگم بھی ایسی ملیں کہ لگا ہے بجا ہے، انہیں تلقین کرتی رہیں، اور بالآخر انہوں نے طے کر لیا، کہ موجودہ ملازمت میں رہتے ہوئے ہی وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

چنانچہ کلرکی کے دوران ہی انہوں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھا، اور ان دونوں فنون میں اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ شارٹ ہینڈ میں آپ کی مہارت کا اعتراف قائدِ اعظم محمد علی جناح جیسے عظیم رہنما نے کیا اور ٹائپ کے لئے بیگم اکرام اللہ جیسی شخصیت کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستان بھر میں صرف مُجاہد حُسین ہی ٹھیک اور صحیح ٹائپ کرنا جانتے ہیں۔ یہ خراجِ تحسین اصل اس فکر کا نتیجہ تھا کہ جو کام بھی کیا جائے پوری لگن اور تندہی سے کیا جائے۔ مجاہد حُسین صاحب کی کامیابی بھی در اصل اسی اصول کی مرہونِ منت ہے۔

لیکن آگے ہی آگے بڑھتے رہنے کے جذبے نے کسی بھی ترقی پر آپ کو اطمینان کا سانس نہ لینے دیا۔ آپ کا ایمان تھا کہ انسان خود ترقی کرنا چاہے تو قدرت اس کو خود بخود مواقع فراہم کرتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ہی انہیں اس طرح کا ایک موقع مل گیا۔ اپنی لگاتار محنت اور بہتر کارکردگی کی بنا پر افسرانِ بالا انہیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا کرتے۔ چنانچہ اسٹینوگرافر کے عہدے سے ترقی پا کر محکمہ سپلائی کے سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ ہو گئے۔ یہ سیکرٹری انگریز تھے، جن کے ساتھ رہ کر مُجاہد حُسین نے بہت کچھ سیکھا۔ اس انگریز کا طریقۂ کار ہندوستانی افسران کے برعکس تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے دفتر آتے اور رات گئے تک بیٹھے کام کرتے رہتے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا تو دراز کھول کر سینڈوچز نکالتے اور صاحب بہادر کا لنچ ہو جاتا۔

اِس طرح انگریز سیکرٹری کے ساتھ مُجاہد حُسین صاحب نے روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کیا۔ آپ آج اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ محنت،

اصول اور فرائض کو پوری ذمہ داری سے سرانجام دینا آپ نے انگریز سیکرٹری سے سیکھا۔ لیکن زندگی کا جو سلیقہ انہیں قائدِ اعظم کے اسٹینو کی حیثیت سے حاصل ہوا، اس نے ہمیشہ کے لئے ان کی راہوں میں روشنیاں بکھیر دیں۔ دسمبر ۱۹۳۷ء سے جون ۱۹۴۰ء تک وہ بابائے قوم سے منسلک رہے اور اپنے کام کا اُن سے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ یہ چیز بظاہر قائدِ اعظم کے کردار کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی شخص سے کام لے کر اسے اس کا معاوضہ ادا نہ کریں۔ لیکن مجاہد حسین نے اس سلسلے میں یہ موقف اختیار کیا کہ سرکاری ملازم کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ مجاہد صاحب کے پاس قائدِ اعظم کا عطا کردہ ایک سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے، جس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ بابائے قوم کے اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔

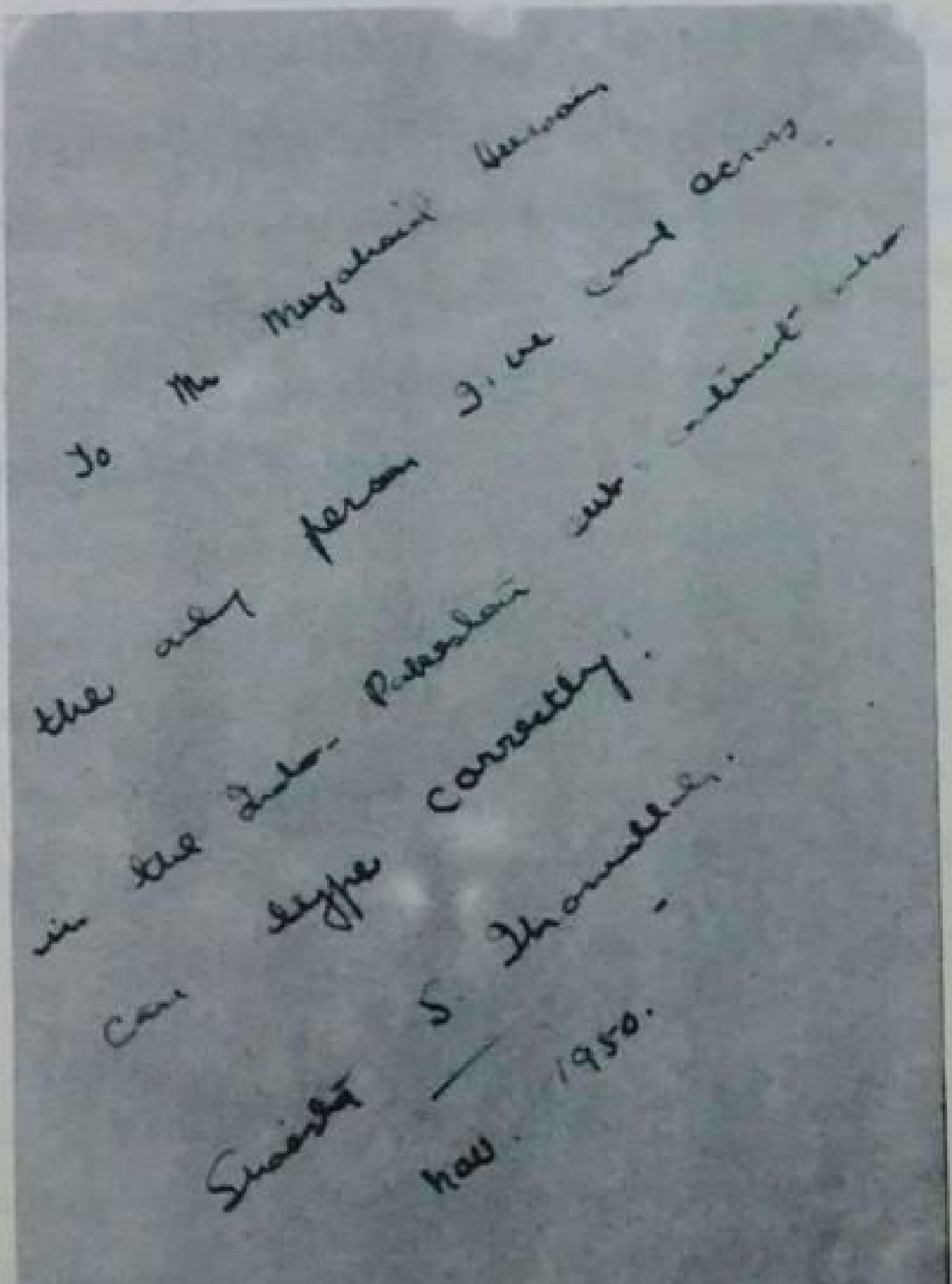
۱۹۴۱ء کے لگ بھگ مجاہد حسین سر ظفر اللہ خاں کے پی اے مقرر ہو گئے جو اس وقت محکمۂ قانون کے وزیر تھے۔ اپنی مختصر سی مدت ملازمت میں ان کے لئے یہ مرتبہ کسی اعزاز سے کم نہیں تھا، اس لئے کہ یہاں تک پہنچنے کے لئے آدمی کو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع کرنا پڑتا تھا۔ اس کامیابی میں محض ان کی ذاتی محنت، کام سے لگن اور ایمانداری و ذمہ داری سے فرائض کی انجام دہی کار فرما تھی۔ یہیں سے مجاہد حسین کے لئے ترقی کے راستے کھلے۔ سب سے پہلے انہوں نے شام کے کالج میں داخلہ لے کر قانون کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور یوں بچپن کی دیرینہ خواہش پوری کر لی۔

۱۹۴۴ء میں انہیں حکومتِ ہند کے محکمۂ سول سپلائز میں انسپکٹر بنا دیا گیا۔ یہ مجاہد حسین صاحب کی پہلی گزیٹڈ پوسٹ تھی، اس کے بعد آپ تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔ محنت، ایمانداری اور اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری سے سرانجام دینا، ان کے کام کرنے کے ان اصولوں نے افسرانِ بالا کی نظروں میں ان کی عزت اور اعتماد پیدا کر دیا تھا چنانچہ پاکستان بنا تو وہ مجاہد حسین الہ آباد میں معمولی کلرک سے ترقی کرتے کرتے محکمۂ انکم ٹیکس اپالیٹ ٹرابیونل کے اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اپنی ملازمت کے ٹھیک تیس سال بعد

۱۹۶۳ء میں جب وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وزارتِ قانون میں ڈرافٹسمین اور جائنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

موصوف کی اس شاندار کامیابی کے پسِ پشت جہاں ان کی ذاتی محنت شامل رہی ہے وہیں ان کی مرحوم بیگم "صبیح مجاہد" کی کوششوں کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ انہیں آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب دفتر سے آتے وقت وہ گھر کا سودا سلف لاتے تو مرحومہ کو برتن دھوتے دیکھ کر خود مسالہ پیسنے لگ جاتے۔ "صبیح مجاہد" انہیں ہمیشہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تلقین کیا کرتیں۔ مجاہد حسین پروردگار کے شکر گزار ہیں کہ بیگم کی زندگی ہی میں انہوں نے اپنے بچپن کی وکیل بننے کی خواہش بھی پوری کر لی۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ کا آٹو گراف اُن کے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ پر
جسے مسٹر مجاہد حسین نے ۱۹۴۰ء میں لندن یونیورسٹی کے اسٹینڈرڈ پر ٹائپ کیا تھا


To Mr Mujahid Hussain
the only person I've come across
in the Indo-Pakistan sub-continent who
can type correctly.
Shaista S. Ikramullah.
Nov. 1950.

(حوالہ: صفحہ ۵۳)

مادرِ ملّت

(جون ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا، اور روزنامہ "جنگ"
کراچی کے مادرِ ملت ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا)

حسبِ عادت گھریلو نوکروں نے مجھ سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے نوکروں میں پرسنل اسسٹنٹ یا پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسی گاؤں میں بوجھ بجھکڑ کی۔ لیکن مقصد ان نوکروں کا کچھ اور ثابت ہوا۔ گھر کے تمام انتظامات مس جناح کے ہاتھ میں تھے۔

مس جناح نوکروں پر اعتماد ذرا کم کرتی تھیں۔ آج سے تیس سال قبل غالباً مارچ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مجھے تین خط ڈاک میں ڈالنے کے لئے دیئے۔

"یہ خط تم خود ڈاک میں ڈالنا، کسی نوکر کو مت دینا، ورنہ ٹکٹ اُتار کر خطوں کو پھاڑ پھینکے گا۔"

"ایسا نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہی تو کرتے ہیں یہ لوگ، تم کیا جانو، اگر تم خود نہیں ڈال سکتے تو لاؤ واپس دو۔"

اس زمانہ میں دو پیسہ میں تین خطوں کا پوسٹنگ سرٹیفکیٹ لیا جاتا تھا، جو اب پندرہ پیسے

میں آتا ہے، میں نے یہ سرٹیفکیٹ خرید کر اپنے پاس رکھا، زیادہ تر اس خیال سے کہ اگر کسی مکتوب الیہ نے کبھی مس جناح سے کہہ دیا کہ مجھے تمہارا خط نہیں ملا، تو میرا شمار بھی انہی لوگوں میں ہونے لگے گا، جو ٹکٹ اتار کر خطوں کو پھاڑ پھینکتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایک مکتوب الیہ نے واقعی یہ لکھ بھیجا کہ خط نہیں پہنچا۔ بڑے آدمیوں میں یہ فیشن بھی عام تھا۔

"تم نے وہ خط بذاتِ خود ڈاک میں ڈالے تھے؟ ان میں ایک نہیں پہنچا!" مس جناح نے ناراضگی کے لہجہ میں مجھ سے کہا۔

"کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہوا جو ہے، یہ دیکھو خط اس مکتوب الیہ کا!"

"یہ دیکھئے پوسٹنگ سرٹیفکیٹ، ان کے نام کا خط اس میں شامل ہے"، میں نے دراز سے سرٹیفکیٹ نکال کر مس جناح کو دیتے ہوئے کہا۔

ان کو سخت حیرت ہوئی، اور مجھے دو پیسے کے بجائے ایک آنہ دے کر سرٹیفکیٹ لے گئیں۔

میں نے جب اس واقعہ ذکر اپنی بیوی سے کیا تو کہنے لگیں کہ مس جناح غیر معمولی طور پر صاف گو اور انتہائی دیانت دار معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی خواتین سے آج کل کے ملازم عام طور پر نالاں ہی رہا کرتے ہیں۔ اگر ہو سکے تو میرے لئے ان سے کوئی وقت لینا چاہئے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جو دن مس جناح نے مقرر فرمایا، اسی دن آل انڈیا ریڈیو سے میری بیوی کے نام پچیس روپے کا ایک چیک آیا تھا، کسی تقریر یا ڈرامہ کے صلہ میں۔ وہ چیک اس نے مس جناح کی خدمت میں پیش کر دیا، یہ کہہ کر یہ میری اپنی محنت کا معاوضہ ہے اور میں اس کو مسلم لیگ کو دینا چاہتی ہوں۔ آپ مسٹر جناح کو دے دیجئے۔ مسٹر جناح اور میں بھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے —— میرا ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تم خود دے دو یہ مسٹر جناح کو"، مس جناح نے کہا۔

"بے حد شکریہ آپ کا، میں آپ کے مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے اتفاق کرنے کی بڑی قدر کرتا ہوں، یہ پچیس روپے، پچیس ہزار روپے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کاش آپ کے

شوہر بھی اس چیز کو سمجھ سکتے ؟

"سرکاری ملازمت کے قواعد و ضوابط سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتے۔" میں نے عرض کیا۔

"شہو! ایک وقت آئے گا جب سرکاری ملازمت میں داخلہ کی شرط مسلم لیگ کی ممبرشپ ہوگی۔" مسٹر جناح نے فرمایا۔

"غیر مسلم لیگی کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" مس جناح نے کہا۔

مس جناح کا برتاؤ ہمارے ساتھ شفقتانہ سے شفقتانہ تر ہوتا گیا، اور جب کبھی ملنا ہوتا وہ بزرگانہ انداز میں پند و نصائح فرماتیں۔ ۱۹۴۷ء میں میرا تبادلہ دہلی سے کراچی ہو گیا۔ پیراڈائز سینما کے سامنے پٹیل چیمبرز کے ایک فلیٹ میں ہمارا قیام تھا جواب "گلزار" کہلاتی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر پٹیل اس کے مالک تھے جن کا شمار چوٹی کے دندان سازوں میں ہوتا تھا۔ ان کا مطب اور متعلقہ کارخانہ بھی اسی بلڈنگ میں تھا۔ میں محکمہ سول سپلائز میں اسسٹنٹ کنٹرولر جنرل تھا، اور میرے فرائض میں کمیاب اشیاء کی خرید کے لئے پرمٹ جاری کرنا بھی تھا۔ ایک روز یوسف ہارون صاحب دفتر میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ مسٹر جناح کو ایک پارکر قلم کی ضرورت ہے، آپ پرمٹ دے دیجئے۔

"مسٹر جناح کا قیام کہاں ہے اور کونسا قلم چاہیئے ان کو؟"

"کراچی میں جسٹس طیب جی کے ہاں مقیم ہیں، پارکر کے بہترین قلم کا پرمٹ دے دیجئے۔"

میں نے ایک کھلا پرمٹ دے دیا کہ جو قلم بھی مسٹر جناح پسند فرمائیں ان کو فروخت کر دیا جائے۔

یوسف ہارون صاحب چلے گئے تو میں نے جسٹس طیب جی کے ہاں ٹیلیفون کیا، مس جناح نے اگلے روز صبح کا وقت دیا، اور ہم تینوں یعنی چشتی، اس کی ماں اور میں حاضر خدمت ہوئے۔ چشتی اس وقت ایک سال کا تھا۔ مس جناح نے اس کو پہلی بار دیکھا، بہت خوش ہوئیں۔ گود میں لیا، مسٹر جناح کو دکھایا، دونوں نے مبارک باد دی، اور دعائیں دے کر واپس کر دیا۔ چند روز بعد مس جناح ایک شام کو پٹیل چیمبرز میں ہمارے ہاں آئیں، اور چشتی کے لئے ایک تحفہ لائیں،

فرمانے لگیں کہ مسٹر جناح ڈاکٹر پٹیل سے دانت بنوانے آ رہے تھے، میں نے کہا کہ میں تم لوگوں سے ملتی چلوں۔ کل ہم لوگ بمبئی واپس چلے جائیں گے۔

بیس سال بعد، اگست ۱۹۶۴ء میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب چشتی کیمبرج جانے لگا تو انہوں نے ہم سب کو خاص طور پر مدعو کیا، اعلیٰ کافی پلائی، اور فلیگ اسٹاف ہاؤس کے باغیچہ میں گروپ فوٹو بھی کھنچوایا۔

یہ تھا سلوک مس جناح کا اپنے ایک خادم اور اس کے بال بچوں کے ساتھ۔

پاکستان میں مس جناح، ابتداء میں قائدِ اعظم کی تیمارداری میں منہمک رہیں، اس کے بعد بمبئی کی جائیداد وغیرہ نے ان کو پریشان رکھا۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں وزارتِ مہاجرین و آبادکاری میں افسر بکارِ خاص تھا اور متروکہ املاک اور اس سے متعلقہ قوانین کے مسودے تیار کر رہا تھا انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور میں دو تین بار خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد ان سے ہماری ملاقات شریف الدین صاحب پیرزادہ کے ہاں ایک ڈنر کے موقع پر ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں، انہوں نے میری بیوی سے خاص طور پر اس بات کی شکایت کی کہ ہم بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ان کو بھلا دیا تھا۔ ان کی شکایت بجا تھی، لیکن ہم ان کو کس طرح بھلا سکتے تھے، وقت کی ایک افسوسناک مصلحت تھی، جس کا تذکرہ جس قدر کم کیا جائے بہتر ہوگا۔

دس سال اسی طرح گزر گئے۔ ۱۹۶۴ء میں جب میں ریٹائر ہو کر وکالت کرنے لگا، تو کرنل جعفر نے ایک روز ٹیلیفون کیا کہ مس جناح تمہیں یاد کر رہی تھیں، اور جب میں نے کہا کہ تم وکالت کرنے لگے ہو، تو فرمانے لگیں کہ میرا کچھ کام ہے، اس سے کہو کہ اب تو کبھی آ کر ملے۔

میں حاضرِ خدمت ہوا، بال بچوں کی خیر و عافیت دریافت فرمانے لگیں، اور خاص طور پر بیوی کے کہنہ مرض، دمہ کے متعلق کہنے لگیں، "مجھے بھی کچھ عرصہ سے سانس کی بیماری ہے، بڑا تکلیف دِہ روگ ہے، خدا کسی کو نہ لگائے۔"

پھر دو کام بتائے، ایک قائدِ اعظم کے وصیت نامہ سے متعلق انکم ٹیکس کی ادائیگی جو

ہندوستان والے طلب کر رہے تھے اور دوسرے مشورہ الانا کے ساتھ قائدِ اعظم کی سوانح حیات لکھنے کے بارے میں مجوزہ معاہدہ جس کا مسودہ الانا صاحب ان کو دے گئے تھے۔ اس مسودہ میں میں نے کچھ رد و بدل کرنا چاہا جس کو مادرِ ملت نے سراہا! اور پھر ایک میٹنگ الانا صاحب کی موجودگی میں ہوئی۔ چند وجوہ کی بنا پر وہ معاہدہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

انکم ٹیکس کا معاملہ ذرا نازک تھا۔ اوّل تو تمام املاک ہندوستان میں، پھر اس پر وہاں کے انکم ٹیکس والوں کی نظر — جو بلا املاک کے بھی ٹیکس طلب کر لیا کرتے ہیں!

میں نے مادرِ ملت کو مشورہ دیتے ہوئے کچھ دشواری محسوس کی اور میں نے دریافت کیا:

"آپ نے اس سلسلہ میں شریف الدین صاحب یا حسن شیخ صاحب سے تو ضرور مشورہ کیا ہوگا؟"

"ارے جا، وہ کیا مشورہ دیں گے!"

"وہ چونکہ بمبئی میں وکالت کر چکے ہیں، اور قائدِ اعظم کے کیمپ کے خاص آدمیوں میں سے ہیں، اس لئے مجھے خیال آیا کہ اس معاملے میں وہ بہتر مشورہ دے سکے ہوں گے۔"

"قائدِ اعظم کا کیمپ کہاں ہے، جو خاص اور بے خاص آدمی موجود ہوں۔ تو بھی تو کیمپ کا خاص آدمی تھا، پندرہ برس بعد آج بلایا تو آیا!"

مجھے اپنی حالت پر اس وقت جس قدر افسوس ہوا شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا بہرحال میں نے مادرِ ملت سے اس بات کی اجازت چاہی کہ میں اپنے دوست مسٹر ایس۔ اے۔ مرزا سے اعانت طلب کروں، جو ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر تھے اور اپالیٹ ٹربیونل کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔ اجازت مل گئی۔ مرزا بہت خوش ہوئے کہ مادرِ ملت کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، جو اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک وہ فلیگ اسٹاف ہاؤس سے ہٹ کر موہٹا پیلس یعنی قصرِ فاطمہ میں منتقل ہو چکی تھیں۔ کم و بیش دو گھنٹے تک مرزا ان کو مختلف مراحل سے آگاہ کرتے رہے اور وہ معاملہ کی پیچیدگیوں کو سمجھتی رہیں۔ پھر نئے مکان کا جائزہ لیا گیا اور ان کو مبارکباد

دے کر ہم رخصت ہونے لگے تو مادرِ ملت باہر تک ہم کو خدا حافظ کہنے آئیں اور باغ کا کچھ حصّہ بھی بہت شوق سے دکھایا۔ یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی، اور مرزا کی پہلی اور آخری دونوں!

مادرِ ملت ۱۹۳۸ء کی مس جناح نہیں رہی تھیں، ان کا مزاج اکثر برہم رہتا تھا، اور بعض اوقات وہ ایسی بات کہہ جاتی تھیں جو بالکل غیر متوقع ہوتی تھی۔ وہ اکثر شبہات میں مبتلا رہتی تھیں، یہاں تک کہ مجھے بھی قائدِ اعظم کے وصیت نامہ اور اس سے متعلقہ کاغذات کو جو کئی بنڈلوں میں اندھا دھند لپٹے ہوئے تھے انہوں نے شروع میں دینے سے گریز کیا، اور بمشکل تمام اس شرط پر دیئے کہ میں کسی اور کو نہیں دکھاؤں گا۔ ان کاغذات کے مطالعہ سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مادرِ ملت کا بھی ایک وصیّت نامہ ہونا چاہیئے۔

"آپ کا وصیّت نامہ تو ہوگا؟"

"میرا کیا وصیّت نامہ، میرے پاس کیا ہے جو وصیّت نامہ لکھوں۔"

"قائدِ اعظم کا وصیّت نامہ ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ آپ کا بھی وصیّت نامہ ہو۔"

"تو پھر ڈرافٹ تو کر دے نا، کیا لکھے گا اس میں؟"

یہ ان کے اپنے الفاظ تھے، اور مادرِ ملت اکثر مجھ سے اردو میں بات کرتی تھیں، اور نہ معلوم کیوں "تو" کہتی تھیں۔ اگر اُس وقت میری ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی یہی کہہ کر پکارتی!

وصیّت نامہ کے ڈرافٹ میں ہر قدم پر مشکل کا سامنا کرنا پڑا، اُن کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ یا تو اُن کا کوئی وصیّت نامہ پہلے سے موجود ہے، یا وہ واقعی وصیّت نامہ کو ضروری نہیں سمجھتیں، بہرحال کرتے کراتے میں نے ایک ڈرافٹ اُن کو دیا، جس میں کئی خانے پُر کرنے باقی تھے وہ کچھ بتا کر ہی نہیں دیتی تھیں۔ انہوں نے وہ ڈرافٹ شوق سے پڑھا اور فرمایا کہ وہ اس کو اپنے پُرانے قانونی مشیر مسٹر کوتوال، کو دکھا کر پکا کر دیں گی۔ پھر نہ معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔

آج نہ مادرِ ملت ہیں، اور نہ میری بیوی۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوا اور میں چشم زدن میں بیوی سے پہلی، اور ماں سے دوسری مرتبہ محروم کر دیا گیا۔

عورت کی تعلیم، ترقّی اور آزادی

(مرحومہ کا ایک مقالہ جو آل انڈیا ریڈیو دہلی
سے ۲۷، مئی ۱۹۴۳ء کو انھوں نے نشر کیا)

عورت کی تعلیم، ترقی اور آزادی وغیرہ ایسی پرانی باتیں ہیں جن کے متعلق کچھ کہنا سُننا بے کار معلوم ہوتا ہے، اور مجھے ڈر ہے کہ اس وقت بھی بہت سی بہنوں نے میرے منہ سے یہ الفاظ — عورت کی تعلیم، ترقی اور آزادی — سُن کر ناک بھوں چڑھائی ہوگی، مگر میں درخواست کروں گی کہ وہ صبر سے کام لیں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ تمام موضوع بہت کچھ فرسودہ ہونے کے باوجود بھی کافی تشنہ ہیں، اور ہماری توجہ کی ان کو بہت زیادہ ضرورت ہے۔

یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے، مگر یہ کہ آزادی دراصل کہتے کس کو ہیں اور یہ کیسے حاصل کی جاتی ہے، ایسے ٹیڑھے سوال ہیں جن کے جواب بہت ہی سوچ بچار اور سنبھل کر دینے چاہئیں، اور پھر عورت کے معاملہ میں تو یہ سوالات اِس وجہ سے اور بھی مشکل ہو جاتے ہیں کہ یہاں آ کر اکثر لوگ انسان کے اس پیدائشی حق سے ہی انکار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں اس وقت کسی طویل بحث میں پڑنا نہیں چاہتی

اور محض اُن آرا کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گی جو عورت کی آزادی اور ترقی کے متعلق وقتاً فوقتاً ظاہر کی جایا کرتی ہیں۔

اُس طبقہ کو جو عورت کی ترقی اور آزادی کو سمجھ بوجھنے کی کوشش کرتا ہے اختلاف رائے کی حیثیت سے تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس کا ایمان ہے کہ عورت پیدا ہی بچّوں کی پرورش، کھانے پکانے اور گھر کی دیکھ بھال کے لئے کی گئی ہے اور اس کے لئے اسی قسم کی زندگی فطرت کے عین مطابق ہے۔ برخلاف اس کے ایک دوسرا گروہ ہے جو مندرجہ بالا تمام فرائض انجام دینے کو عورت کی آزادی اور ترقی کا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک عورتوں کو گھر سے باہر آ کر ان کاموں کو اپنا لینا چاہیئے جو آج تک صرف مردوں کے لئے مخصوص رہے ہیں۔ اب رہا تیسرا گروہ، وہ اِن دونوں انتہا پسندوں کے بین بین ہے، یعنی اس طبقہ کا خیال ہے کہ عورت نہ تو خانگی دنیا سے رشتہ توڑے اور نہ بیرونی دُنیا سے بے خبر رہے، بلکہ دونوں جگہ اپنے حسبِ توفیق اس کو اپنے تعلقات استوار رکھنے کا حق حاصل ہے۔

ان تینوں گروہوں میں سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پہلے دو تو کسی گنتی ہی میں نہیں، کیونکہ عورت نہ تو ان فرائض کو ترک کر سکتی ہے جو فطرت نے اس کو اور صرف اس کو سپرد کئے ہیں، اور نہ اس کے لئے بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر لینا مناسب ہے کیونکہ نوعِ انسان کے آدھے طبقہ کا حق انسانیت سے محروم ہو کر صرف گھر کی محدود فضا میں سمٹ جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کو گوارا کر لینا انسانیت کے شایانِ شان ہو۔

رہ گیا تیسرا گروہ، مندرجہ بالا توضیح کی روشنی میں وہی نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے جو گھر کی اور باہر کی، دونوں دنیاؤں کو نباہنے کا حامی ہے۔ مگر کسی نظریہ کا اصولاً صحیح ہونا اس کی عملی کامیابی کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ صورت موجودہ معاشرہ کے ہوتے ہوئے نہایت ہی دشوار ہے، اور ایک ایسا بوجھ ہے جس کو عورت کے کاندھے برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ موجودہ معاشرہ میں ایک عورت کو اپنے گھر میں اس قدر

مختلف قسم کے کام انجام دینے پڑتے ہیں کہ وہ اکثر اوقات ذہنی الجھن میں مبتلا ہوتی ہے اور اپنی بھوک کھاتی ہے۔ پھر ایسی صورت میں بیرونی ذمہ داریوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی انقلاب کی ابتدا میں انتہائی ضرورتیں عورت کو باہر لے آئی ہیں اور وہ اپنی خدمات سے اپنی قابلیت ثابت کر دکھاتی ہے تو کچھ تو اس کے احسانات کے بدلے اور کچھ خود اس کے اسی احساس اور تجربہ کی بنا پر کہ وہ باہر کی دنیا کے ہر کام کے لائق ہے، عورت کو اس باہر کی دنیا میں دخل ہو جاتا ہے مگر وہ زیادہ عرصہ تک اس کو نبھا نہیں سکتی اور خانگی فرائض اس کو اس بُری طرح پیچھے کھینچتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے اور اس کشمکش کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ترقی میں تسلسل نہیں پایا جاتا اور یہ عدم تسلسل ہی ان لوگوں کے لئے ایک بہت بڑی دلیل بنا ہوا ہے جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورت باہر کی دنیا کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے نظامِ معاشرت میں وہ کونسی کمی ہے جس کی وجہ سے ہم عورتیں ایسی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ کمی دراصل "تقسیمِ عمل" کی کمی ہے، اور بلاشک وشبہ یہ ایک ایسی کمی ہے جس پر آج تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اگر دی جاتی تو یقیناً آج سے بہت پہلے ہماری ان تمام مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تہذیب، تمدن اور ترقی کی تشکیل میں ایک بہت بڑا دخل "تقسیمِ عمل" کو ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ تہذیب اور تمدن "تقسیمِ عمل" ہی کی بدولت انسان کی زندگی میں شامل ہوئے۔ معاف کیجیے اس کو سمجھنے کے لئے مجھے پھر تاریخ کا حوالہ دینا ہوگا۔ ابتدا میں جبکہ انسان مہذب نہیں تھا اور انفرادی زندگی بسر کرتا تھا تو اپنی ہر ضرورت خود ہی پوری کر لیا کرتا تھا مگر جب اس میں تہذیب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے مل جل کر رہنا سیکھا تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ اس تمام جماعت کی جو ایک جگہ رہتی تھی تمام ضروریاتِ زندگی اکٹھی کی گئیں اور ان کو آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا گیا مثلاً اس کے بجائے کہ جب

ایک انسان اپنی زندگی شروع کرے تو خود ہی اپنے لئے مکان تعمیر کرے، خود ہی کپڑا بُنے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کام چھوٹے چھوٹے گروہوں کے سپرد کر دیئے گئے اور اسی کو "تقسیم عمل" کہتے ہیں! اس سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ تقسیم زر کی صورت خود بخود پیدا ہو گئی، دوسرے یہ کہ کام جلدی اور عمدگی کے ساتھ ہونے لگا اور تیسرے یہ کہ انسان کا وقت ایسے دوسرے کاموں کے لئے بچنے لگا جو صرف جینے کے لئے تو ضروری نہیں ہیں مگر زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں، مثلاً شاعری، مصوری وغیرہ۔

مگر غریب عورتیں اس سے محروم رہیں۔ کیوں رہیں اور اس کے کیا اسباب تھے، یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہ وقت نہیں، مگر رہیں بہر حال۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ عورت آج بھی اسی دنیا میں زندگی بسر کر رہی ہے جس میں آج سے کروڑوں برس پہلے وحشیوں کے زمانہ میں بسر کیا کرتی تھی۔

یہ بات ایک متوسط گھر کا جائزہ لینے سے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ایک متوسط گھر کو دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ اس گھر میں جتنی چیزیں مردوں کی بنائی ہوئی ہوں گی ضروری نہیں کہ سب کی سب چیزیں اسی گھر کے مرد کی بنائی ہوئی ہوں، بلکہ اکثر و بیشتر یا زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہیئے کہ تمام چیزیں دوسرے مردوں کی صنعت اور کاریگری کا نمونہ ہوں گی۔ برعکس اس کے جو اشیاء عورتوں کی تیار کی ہوئی ہوں گی وہ زیادہ تر گھر والی کے ہاتھ کی مرہونِ منت ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وجہ سے ہے کہ مردوں میں "تقسیم عمل" کا رواج ہے اور عورتوں میں نہیں۔ وہ گھر کے تمام چھوٹے بڑے کام ذاتی طور پر کرتی ہیں اور انتہا یہ ہے کہ کھانا پکانا، سینا پرونا، بچوں کی پرورش جیسے کام بھی انفرادی طور پر انجام دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان سب کاموں میں تقسیم ہونے کی بہت اچھی اہلیت پائی جاتی ہے۔ اسی بات کو ایک نہایت ہی چھوٹی اور معمولی مثال سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے اکثر شہروں میں ہر موسم میں اور خصوصاً گرمیوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ عورتیں دوپہر کی روٹی گھر پر تیار نہیں کرتیں، بلکہ ہر محلہ میں کوئی ضرورت مند عورت ایک تنور قائم کر لیتی ہے اور

محلہ کی تمام عورتیں روٹی اُسی سے پکواتی ہیں۔ اس طرح اگر ایک طرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ عورتوں کو دستکاری کے لیے بہت سا وقت بچ جاتا ہے، تو دوسری طرف ایک غریب عورت کا بھلا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی ادنیٰ مثال ہے۔ مگر یہ اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ ہمارے کام تقسیم کئے جا سکتے ہیں؛ اور اگر اسی طریقہ کو وسعت دے کر باقاعدگی سے کام کے ہر شعبہ میں رواج دے دیا جاتا تو وہ فائدے حاصل ہوتے جو آج ہمارے وہم و گمان سے بھی پرے ہیں۔ مگر اس حقیقت کے باوجود حالت یہ ہے کہ ہر عورت کا دائرۂ عمل الگ الگ ہے اور ایک ہی چار دیواری تک اُسی طرح محدود ہے جس طرح عہدِ ماضی میں ہوا کرتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ تمام کام باوجود سہل ہونے کے اپنی اس خرابی کی وجہ سے عورت کے لئے ہمیشہ سے مصیبت بنے ہوئے ہیں اور عورت کے دماغ اور جسم کو اس بری طرح مصروف کئے ہوئے ہیں کہ اسے بجز ان کاموں کے نہ کہیں کا ہوش ہے اور نہ کسی چیز کی فرصت۔ اور آج جبکہ سخت سے سخت حکومت میں بھی آٹھ دس گھنٹہ سے زیادہ کام لینا خلافِ انسانیت سمجھا جاتا ہے، عورت چوبیس گھنٹہ کام کرتی رہتی ہے اور اس طرح کبھی بھی اس کو زندگی کے دوسرے شعبوں پر توجہ دینے کا وقت نہیں ملتا۔

اس عدم تقسیم نے جہاں عورت کے لمحاتِ فرصت اور دل و دماغ کے سکون کا خون کیا ہے، وہاں اس کا اقتصادی پہلو بھی نہایت ہی کمزور کر دیا ہے۔ باوجود دن رات کی اَن تھک محنت کے بہ استثنائے چند وہ اس معاملہ میں بہت ہی قابلِ رحم ہے۔ اس کی یہ محنت اس کے لئے کوئی ذاتی ملکیت پیدا نہیں کر سکتی اور اس کی حیثیت ایک خزانچی سے آگے بڑھنے نہیں پاتی۔

"تقسیمِ عمل" کی صورت میں اس اقتصادی بدحالی کا خود بخود انسداد ہو سکتا ہے اور یہی اجرت جو آج تک عورت کو اُس کی اس درجہ اَن تھک اور مسلسل محنت کے باوجود امانت بلکہ "بخشش" کے طور پر دی جاتی رہی ہے، ایک باعزت صلہ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ کیونکہ اگر عورت ان سب منتشر خدمات کو جو وہ پرائیویٹ حیثیت سے انجام

دیتی ہے ایک ترتیب اور نظام میں لے آئے تو ظاہر ہے کہ ان سب کی اُجرت بھی منظم اور مقرر ہو جائے اور کم از کم یہ اُجرت تو اس کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے۔

غالباً اس سمع خراشی کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے کہ ہمیں کون سا کام اختیار کرنا چاہئے اور کون سا ترک۔ بلکہ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام کاموں کو جو ہمیں انجام دینے ہیں کس طرح انجام دیا جائے۔ اس کا جواب بہت ہی آسان ہے، یعنی یہ کہ ترتیب اور تقسیم کے اصولوں پر کاموں کو اس طرح بانٹا جائے کہ فرصت اور دولت دونوں کا حصول ممکن ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو اس جواب کی وضاحت پھر کبھی کروں گی۔

آل انڈیا ریڈیو کا اجازت نامہ

Government of India,
ALL INDIA RADIO DELHI.

......

Ref. No. 20/PD/1 Dated. 10 AUGUST 19[illegible]

Begam Sub[illegible] Mujahid,
172, Rouse Avenue,
New Delhi.

Dear Madam,

Reference your letter of the 17th July 1942, we enclose herewith a copy of your talk broadcast on the 27th May, 1942. We have no objection to its publication provided it is duly acknowledged that it was broadcast from All India Radio, Delhi and is published with the permission of the Station Director.

Yours faithfully,
[signature]
DIRECTOR OF PROGRAMMES
FOR STATION DIRECTOR.

Encl.As above.

10/8

MH.10/8.

(حوالہ: صفحہ ٦)

مرورِ زمانہ

[تیس سالہ سرکاری مُلازمت کی آپ بیتی "بسے رنج بُردم دریں سال سی" کا ایک ورق]

(علامہ اقبالؔ مرحوم کا شعر۔

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

معلوم کب کہا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں کم و بیش پچاس سال پُرانا ضرور ہوگا۔ اُس سال میں پاکستان ہائی کمیشن، دہلی میں بحیثیت فرسٹ سکریٹری تعینات تھا۔ دہلی تو اتنی پراگندہ نہیں تھی جتنا دل پراگندہ تھا۔ اُس وقت کے ماحول سے پریشان ہو کر یہ اشعار لکھے گئے۔ اور "امروز" کراچی، میں اُسی سال شائع ہوئے)

فضائیں کچھ ایسی مکدر ہوئی ہیں چمن کا وہ نقشہ نظر آ رہا ہے
کہ شاید کسی کو تعجب نہ ہوگا نفس آشیانوں کو گر پھونک ڈالیں

میں صحرا نوردی کا مارا ہُوا ہُوں مجھے فکرِ رہبر نہ احساسِ منزل
جنہیں خضر کی ہمسری کا ہو دعویٰ مرے پاؤں سے پہلے کانٹے نکالیں

مصائب، تکالیف، افلاس، غربت ترے عشق کے ہیں یہ دو چار تحفے
اجازت اگر ہو تو دستِ کرم کی کروں پیش کچھ اور زندہ مثالیں

کوئی رشکِ حور اور کوئی رشکِ غلماں کہیں سازِ مطرب کہیں دورِ ساقی
میں محفل ہیں تیری انہیں ڈھونڈتا ہوں شبِ ہجر تھوڑا سا جو غم بٹا لیں

فضول آج دیر و حرم کے قواعد غلط آج معیارِ مکر و ریا سب
گیا وقت جب دل لرزتا تھا اُن پر نہ بانگِ اذاں اب نہ واعظ کی چالیں!

مارشل لا ریگولیشن نمبر ۶۴

("زرعی اصلاحات کا قانون کیونکر مرتب ہوا"
روزنامہ "جنگ" کراچی، مورخہ ۹ فروری ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا)

مارشل لا کے نافذ ہونے پر جو ریگولیشن اور آرڈر شائع ہوئے وہ میرے لئے بالکل نئے تھے۔ بحیثیت پارلیمانی ڈرافٹسمین ہر قانون کا مسودہ میرے ہاتھوں سے گزرنا ایک عام بات تھی، اور جب کبھی کوئی بل اسمبلی میں پیش ہوتا، یا کوئی آرڈی ننس گزٹ میں نکلتا، تو وہ میرا دیکھا بھالا ہوتا تھا۔ لیکن مارشل لا ریگولیشن اور آرڈر شئے دیگر ثابت ہوئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ریگولیشن اور آرڈروں کا ایک سیٹ ہوتا ہے جو ہر مارشل لا کے نافذ ہوتے ہی شائع کر دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد جوں جوں خاص صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے مطابق خاص ریگولیشن اور آرڈر مرتب کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ کام فوجی جج ایڈووکیٹ جنرل کے ذمہ ہوتا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، کہ اول تو کچھ عرصہ کے لئے ڈرافٹنگ سے نجات ملی، دوسرے افواج کی نگرانی میں ذرا پاؤں پھیلا کر سونا نصیب ہوا۔

مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! لپٹا ہوا بستر کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ حکم ہوا، باوجود بھٹو کی منسوخی کے دستور کو چالو رکھنے کے لئے قانون بناؤ۔ اور چونکہ یہ قانون از بسکہ دستوری قسم کا ہوگا، لہٰذا فوجی جج ایڈووکیٹ جنرل اس کو ڈرافٹ نہیں کریں گے۔ مجھے اس حکم سے ایک خاص خوشی ہوئی، کیونکہ دستور ڈرافٹسمین کے لئے وہی درجہ رکھتا ہے جو ایک مسلمان کے لئے قرآن حکیم۔ ذاتی آرام اور سہولتیں عارضی ہوا کرتی ہیں۔ مارشل لا کے دوران دستور کا جاری رہنا ایک ایسی یادگار ہے جسے آنے والی نسلیں کبھی نہیں بھلا سکتیں۔ دراصل یہ آگ اور پانی کا ساتھ تھا اور سائنس کے ایسے فارمولوں کے موجد شاذ و نادر ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ڈرافٹسمین کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر ایک صدی میں ایک ہو جائے تو اس ملک کی خوش قسمتی سمجھئے، لیکن ایک چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا دستور سامنے رکھ کر قدم آگے بڑھانا عجوبۂ روزگار ہے۔

ابھی چند مہینے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک صاحب دستک کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ کاغذات مجھے دے کر کہنے لگے کہ سر ایڈورڈ نے یہ ڈرافٹ آپ کے پاس دستخط کے لئے بھیجا ہے۔

"میں ڈرافٹ کی چھان بین کیا کرتا ہوں، دستخط تو سر ایڈورڈ ہی کریں گے"، میں نے ان سے کہا اور تشریف رکھنے کے لئے اشارہ کیا۔ آدمی وجیہہ اور بارُعب تھے اور خاندانی اخلاق کے حامل معلوم ہوتے تھے۔ ان کو میری بات غالباً خلاف توقع ہونے کی وجہ سے ناگوار گزری۔ کیوں کہ جب میں نے انہیں چائے کی پیش کش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

فرمانے لگے "لاٹ صاحب کا حکم ہے کہ اس ڈرافٹ کو آج وزارتِ قانون سے پاس کرا کر میرے پاس لاؤ۔ اور آپ ہیں کہ چھان بین کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ڈرافٹ ماہرین نے تیار کیا ہے۔ زرعی اصلاحات کمیشن کی سفارشات پر مبنی ہے اور اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں، آپ اس پر صاد کر دیجئے، دستخط میں آپ کی وزارت کے سیکرٹری سر ایڈورڈ سے کرا لوں گا۔"

"کون لاٹ صاحب؟" میں نے دبی آواز میں دریافت کیا۔

"اختر حسین صاحب، گورنر مغربی پاکستان"

"وہ اراضیات کے ماہر ہیں، ان کے لئے یہ ڈرافٹ ایک ادنیٰ سی چیز ہے، لیکن میں باوجود یوپی اور پنجاب دونوں صوبوں کے قوانین ارضی میں گریجویٹ ہونے کے اس کو سمجھنے میں کافی دقت محسوس کر رہا ہوں اور بغیر سمجھے اس پر صاد کیسے کر سکتا ہوں؟" میں نے ڈرافٹ کے ابتدائی مطالعہ کے بعد کہا۔

"وہ مطمئن نہ ہو سکتے تھے نہ ہوئے، اٹھ کر چلے گئے لیکن جلد ہی سر ایڈورڈ کے ہمراہ واپس تشریف لے آئے۔ سر ایڈورڈ معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے تھے، کہنے لگے۔

"کتنا وقت تم سمجھتے ہو کہ اس میں لگ جائے گا؟"

"لگاتار اگر کام کیا جائے تو شاید دس بارہ روز میں تشفی بخش ڈرافٹ تیار ہو سکے"

"موضوع انوکھا اور دفعات انقلابی معلوم ہوتی ہیں!"

"قطعاً! مجھے پنجاب کی اراضیات کا از سرِ نو مطالعہ کرنا پڑے گا اور زرعی اصلاحات کمیشن کی رپورٹ اور سفارشات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوگا۔ اگر یہ چیزیں پہلے سے مل جائیں تو بات اور تھی"

"ٹھیک کہتے ہو، لیکن اگر خان بہادر تمہارے ساتھ بیٹھ جائیں تو شاید کام جلدی ہو جائے؟" سر ایڈورڈ نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اور میں نے دونوں کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی محتاج سخیوں کو دیکھتا ہو۔

دراصل پاکستان میں پارلیمانی ڈرافٹنگ کے معنی وہ نہیں ہیں جو انگلستان میں سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ ہمارے تمام قوانین انگریزی وضع کے ہیں اور انگریزی زبان میں مُرتّب کئے جاتے ہیں۔ وہاں اگر کسی قانون کی ترتیب کا شائبہ بھی ہوتا ہے تو ڈرافٹسمین کو فوراً مطلع کر دیا جاتا ہے کہ فلاں موضوع زیرِ غور آنے والا ہے، ہوشیار ہو جاؤ وہ کسی اسسٹنٹ

کو مضمون کی تیاری پر مامور کر دیتا ہے اور خود بھی حسبِ ضرورت اس کا مطالعہ کرتا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب نوبت ڈرافٹ کرنے کی آتی ہے تو کم سے کم وقت میں عمدہ سے عمدہ بل تیار ہو جاتا ہے۔

زرعی اصلاحات کمیشن مارشل لا کے نفاذ سے کئی سال پہلے بنا تھا۔ اور اس کی سفارشات بھی مارشل لا سے پہلے کی حکومتوں کے زیرِ غور آ چکی تھیں، لیکن چونکہ جاگیر دار اور جائدادوں کے زیر و زبر ہونے کا مسئلہ تھا، اس لئے کسی نے اس باب میں قانون بنانے کی ہمت نہ کی۔ اگر مارشل لا نہ آتا تو شاید وہ سفارشات بھی کھٹائی میں پڑی رہتیں۔ دفعتًا ایسے قانون کا مسودہ تیار کر دینا کوئی بازیچۂ اطفال نہ تھا۔

گھسیارے کو بھی گھاس کاٹنے کے لئے کچھ وقت دیا جاتا ہے، اور چونکہ مجوزہ قانون کو ایک مارشل لا ریگولیشن کی شکل میں مرتب کرنا تھا، اس لئے میں ذرا زیادہ متذبذب ہوا۔ اس سے پہلے میں نے کوئی مارشل لا ریگولیشن ڈرافٹ نہیں کیا تھا۔

خان بہادر بھی حیران نظر آتے تھے، کہ پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیہ! انھوں نے لاہور فون کیا کہ کمک درکار ہے۔ چنانچہ کمیشن کے دو خاص ممبر، مسٹر آئی یو خان اور مسٹر غلام اسحٰق خاں کراچی تشریف لائے اور کام باقاعدہ شروع ہوا۔ اختر حسین صاحب میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ انھوں نے آئی یو خان صاحب کی زبانی پیغام بھیجا کہ اس ڈرافٹ کو میرا ذاتی کام سمجھ کر اپنی روائتی خوش اسلوبی سے، مگر جلد از جلد مکمل کر دو۔ اندھے کو کیا چاہیئے۔ دو آنکھیں! آئی یو اور غلام اسحٰق خاں صاحبان کی رہنمائی نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور صبح سے شام تک مذاکرات کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ میرے اسسٹنٹ ڈرافٹسمین، محمد صالح میرے ساتھ تھے، اور خان بہادر کا وسیع تجربہ ہم سب کی پشت پناہی کے لئے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اصل ڈرافٹنگ مجھے اکثر رات کو کرنا پڑا۔ جاڑے کا موسم، بیوی دمہ کی پرانی

ریض، کبھی اس کی تیمارداری کرتا اور کبھی ویسٹ پاکستان لینڈ ریفارمز ریگولیشن کی۔ بہر حال کرتے کراتے دس دن کے اندر یہ مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور ، فروری ۱۹۵۹ء کو جب مارشل لا ریگولیشن نمبر چونسٹھ غیر معمولی گزٹ میں شائع ہوا تو پاکستان میں جمہوریت کی ایک نئی داغ بیل پڑی اور عام حقداروں کو ان کے حقوق عطا ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس میں ڈرافٹنگ کی کوئی غلطی آج تک نہیں پائی گئی اور اس کے عمل درآمد میں کوئی خاص دقّت پیش نہیں آئی۔

اراضیات اس قدر بے مروّت مضمون ہے کہ ذرا سا وقت گزرنے پر بھول جاتا ہے۔ کم و بیش چھ سال بعد ۱۹۶۵ء میں جبکہ مجھے ریٹائر ہوئے دو سال کے قریب ہو گئے تھے مغربی پاکستان کی حکومت نے اپنے لینڈ ریونیو بل کا ڈرافٹ میرے سپرد کیا۔ ہر چیز نئی معلوم ہوئی۔ بل کافی ضخیم اور اہم تھا۔ صوبائی اسمبلی کی سیلکٹ کمیٹی میں گیا۔ مجھے بھی وہاں حاضر رہنے کا حکم ملا۔ انتہائی خلوص کے ساتھ جن صاحب سے کمیٹی روم میں ملاقات ہوئی، وہ تھے سرایڈورڈ کے خان بہادر ـــــ ملک خدا بخش بُچّہ، وزیرِ زراعت!

مولوی محمد اظہار حسین قرنی کا تبصرہ

قلمی کاوش موسومہ "رُوحوں کے رشتے" برادر عزیز مکرم مجاہد حسین (ریٹائرڈ ڈرافٹس مین) کی تالیف ہے جو اپنے تخیل و تشکل کے اعتبار سے تصنیف سے بھی زیادہ طبع زاد ہے۔ مصنف نے اپنی اہلیہ ہمشیرہ مرحومہ مسز طیبہ صبیح مجاہد کو خراجِ محبت گوناگوں یادوں کی شکل میں اس جامع انداز سے پیش کیا ہے کہ مرحومہ کی ذات باصفات ایک یاد محل کی صورت میں زندہ جاوید ہوگئی ہے۔ مثلاً موصوف کا اختتامی شعر (خلشِ یادِ طرب) سُن کر حساس طبیعتوں پر وجدان کی سی اشکبار کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اختتامی نظم (گم گشتۂ منزل) پڑھ کر شدید درد بھری لذت پسلیاں چیرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک رینگتی محسوس ہوتی ہے۔ حاصل کلام مجنوں کی نظر میں یہ یاد محل کسی طرح بھی تاج محل سے کم شان دار نہیں۔ وہ کروڑوں روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا تھا تو یہ کروڑوں یادوں کی برکت سے تیار ہوا ہے۔

سب سے بڑی خوبی یہ کہ سکون آفریں یادوں کی فراق زدہ برات نے ایک طرف مصنف کی شبِ غم کی تاریکی کو صبحِ مجاہد کی سی روح افزا روشنی میں تبدیل کر دیا تو دوسری طرف نکتہ فہم ناظرین کو اسی روشنی میں وہ راستہ بھی سمجھا دیا۔ جس پر گامزن انسان غم کے تخریبی آزار کو تعمیری اوزار میں ڈھال سکتا ہے۔ کم از کم میں نے اس اچھوتی کتاب سے یہی سبق حاصل کیا ہے اور یہ چیز زندگی کے ڈگمگاتے سفر میں بادبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیئے روحانی تسکین کے لئے بہتر ہو گا کہ "رُوحوں کے رشتے" کبھی نظر سے اوجھل نہ ہوں۔ ؎

سینے میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ، پردہ میں ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

("دُدِ آتشہ"، صفحہ ۱۰۲) (حوالہ: صفحہ ۷)

وہم

(افسانہ جو "اخبارِ خواتین" کراچی
مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا)

سلمٰی اور عذرا اسکول سے گھر روانہ ہوئیں تو معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی تھی کیونکہ اسکول میں ایک خاص پروگرام تھا۔ اندھیرا اتنا تو نہیں ہوا تھا کہ کسی طرح کا ڈر محسوس ہو۔ پھر بھی گلی کوچوں میں دھند سا چھایا ہوا تھا اور سردیوں کی رات بڑھی چلی آ رہی تھی۔ سلمٰی جو اسکول سے ہی تنہا چلنے سے ہچکچا رہی تھی، راستہ بھر خود بھی ڈرتی رہی اور عذرا کو بھی ڈراتی رہی۔ اس کا ڈر بھی عجیب تھا۔ وہ راستے کے اندھیرے یا کسی خطرے سے نہیں بلکہ اپنے تنہا دیکھ لئے جانے سے خوف کھا رہی تھی۔ وہ بار بار عذرا کو جلدی کی تاکید کرتے کہتی "بھئی ذرا تیز قدم بڑھاؤ کہیں وہ کوٹنے والے بچپا نہ مل جائیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں ایسا ڈانٹیں گے کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں، اور اگر کہیں خدانخواستہ دو گھر پرے رہنے والی منشی جی کی بیوی کی نظر پڑ گئی تو سمجھ لو کہ آ گئی قیامت، امی سے الگ ڈانٹ پڑے گی اور سارے محلّہ میں جو فضیتا ہو گا وہ الگ۔ عذرا کو اس کی باتوں پر غصّہ تو بہت آ رہا تھا، مگر وہ خاموش تھی۔ کیونکہ یہ وقت بحث کا نہ تھا۔

سلمٰی نے سوچا تھا، ماں سے جھوٹ بول دے گی کہ اسکول کی مائی ساتھ تھی۔ باہر سے ہی واپس ہو گئی۔ مگر جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ ماں تو بیٹی کے انتظار میں دروازے سے ہی لگی

کھڑی تھی۔ لڑکیوں کو تنہا دیکھ کر گویا قیامت ہی تو آ گئی۔

"توبہ ایسی بھی کیا قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی جو منہ اٹھا کر چل دیں۔ اسکول کی ماسی تو کہیں نہیں مر گئی تھی۔ جوان لڑکیوں کا تنہائیوں بے وقت نکلنا بھلا کہاں کی تُک ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں عورت موتی ہے تو عزت اُس کی آب۔ ایک بار جھوٹوں بھی چلی جائے تو پھر نہیں آتی۔"

عذرا کا دل چاہا کہے "موتی اگر واقعی موتی ہے تو اُس کی آب کبھی نہیں جا سکتی۔ صدیوں کی کیچڑ مٹی بھی اُس کی آب و تاب میں فرق نہیں ڈال سکتے۔" مگر وہ صرف یہ کہہ سکی۔ "خالہ جان! اس طرح تو ہم لڑکیوں کے لئے بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"مشکل کی کیا بات ہے بیٹی! بس اب دسویں کر لو اور گھر بیٹھو۔ شریف زادیوں کی طرح۔" پھر خود ہی اپنے لہجے کی سلسل سختی محسوس کر کے قدرے نرمی سے بولیں۔ "بیٹی! خدا نے ہم عورتوں کو شیشے کی طرح شفاف بھی بنایا ہے اور نازک بھی۔ کسی نے سانس لیا اور دھند چھائی۔ ٹھیس لگی اور بال پڑا۔ نہ بھی پڑے تو کسی نے جھوٹوں ہی کہہ دیا یا انگلی اٹھا دی اور دلوں میں شک بیٹھے اور وہم پڑ گئے تو سمجھو سد مارے گئے۔ بیوی یہ وہم ہے بُری بلا۔ کیا نہیں ہے بزرگوں نے 'تھال گری جھنکار ہوئی، تھالی تھی یا بھری کون جانے۔' سچ کہتے ہیں بد اچھا اور بدنام بُرا۔"

بیچاری اماں اتنی لمبی تقریر کے بعد سانس درست کرتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ ان کو اس سے کچھ غرض نہ تھی کہ آج کل کے ذہنوں پر ان کی باتوں کا کوئی اثر ہو گا بھی کہ نہیں۔ انہوں نے تو جو کچھ اپنے بزرگوں سے سُنا تھا، وہی کا وہی بڑی دیانت سے بچیوں کے ذہنوں میں انڈیل دیا تھا۔ عذرا اپنے گھر کے سارے راستے بڑے تعجب اور تاسف سے سوچتی گئی کہ یہ بڑی بوڑھیاں عورت کی بے عزتی اور بدنامی اور مرد کے وہم اور شک کے ہوّے کو سلمیٰ جیسے سیدھے سادے ذہنوں پر کس بُری طرح مسلط کرتی ہیں کہ وہ مرتے دم تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

دسویں کا امتحان دیتے ہی عذرا اپنے باپ کے تبادلہ کی وجہ سے دوسرے شہر چلی گئی۔ امتحان کا نتیجہ دونوں سہیلیوں کے لئے اس حد تک تو یکساں رہا کہ دونوں پاس ہو گئیں۔ مگر آگے راہوں میں اختلاف ہو گیا۔ عذرا تو کالج میں داخل ہو گئی، مگر سلمیٰ مجبور تھی۔ کیونکہ اس چھوٹے سے شہر

میں لڑکیوں کا علیحدہ کالج نہیں تھا اور سلمٰی کی ماں لڑکوں کے کالج میں بیٹی کے داخلہ پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ سلمٰی کو اس وقت عذرا بڑی شدت سے یاد آئی۔ اس کو یقین تھا کہ اگر عذرا ہوتی تو ضرور اس آڑے وقت میں اس کے کام آتی۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال بعد جب عذرا نے واپس آکر تیسرے سال میں داخلہ لیا تو سلمٰی اپنے داخلہ کے لئے اس کے پیچھے پڑ گئی۔ عذرا کی دلیلیں تو ماں پر کیا خاک اثر کرتیں، ہاں اس کی بتائی ترکیب اپنا اثر کر گئی۔ سلمٰی کی گریہ زاری اور بھوک ہڑتال کے آگے ماتا نے ہتھیار ڈال دئے اور سلمٰی عذرا کے ساتھ کالج جانے لگی۔

ابھی سلمٰی کو کالج میں داخلہ لئے مشکل سے دو ہفتے ہوئے ہوں گے کہ ایک دوپہر اس کی ہونے والی ساس بے سان و گمان اُن کے ہاں وارد ہو گئیں۔ وہ اس شہر میں کسی عزیز کے ہاں آئی تھیں۔ ازراہِ عنایت سمدھیانے بھی پہنچ گئیں۔ سلمٰی کالج گئی ہوئی تھی۔ سمدھن کو دیکھتے ہی بیچاری ماں کے ہوش اُڑ گئے۔ ان کو معلوم تھا کہ بیٹی کی ہونے والی سسرال پُرانے خیالات کی ہے۔ اسی لئے وہ اور بھی شد و مد سے سلمٰی کے کالج میں داخلہ کی مخالفت کر رہی تھیں۔ مگر جب سلمٰی کی ضد سے مجبور ہوئیں تو انہوں نے یہ سوچ کر تسلی دے لی تھی کہ اتنی دُور سے کون آتا جاتا ہے۔ بات کھُلنے نہ پائے گی، چنانچہ اس وقت سمدھن کو دیکھ کر ان کی وہی کیفیت ہوئی کہ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"۔

سمدھن کے بار بار پوچھنے پر غریب کبھی ٹالتیں، کبھی کوئی اُلٹا سیدھا بہانہ بناتیں اور بڑی بے قراری سے سلمٰی کی واپسی کی منتظر تھیں۔ خدا خدا کر کے سلمٰی کی واپسی ہوئی تو ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی کہ کالج جانے کا بھید کھُلنے نہ پائے۔ سلمٰی ابھی کچھ سمجھنے یا نہ سمجھنے کی کشمکش میں ہی تھی کہ عذرا نے جو اس کو چھوڑتی ہوئی اپنے گھر جاتی تھی، باہر ہی سے ہانک لگائی "کل کالج آٹھ بجے سے ہے ذرا جلدی تیار ہو جانا"۔ یہ فقرہ گویا بم کا گولہ تھا جس نے پھٹ کر ماحول کو یکدم تہ و بالا کر دیا۔ ماں کی صفائی کی کوششیں اور طرح طرح کی یقین دہانیاں کہ کل ہی کالج سے اُٹھا لونگی، کارگر نہ ہوئیں اور سمدھن صاحبہ کی تسلی ہوئی تو صرف اِس وعدے سے کہ شادی دو ڈھائی ماہ کے اندر اندر کر دی جائے گی۔

اور پھر اگلی صبح جب عذرا سلمٰی کو لینے آئی تو عجیب عالم تھا۔ سلمٰی گھٹنوں میں منہ دیئے

سسکیاں بھر رہی تھی اور ماں بے چاری جس کی حالت حقیقت میں زیادہ قابلِ رحم تھی دونوں ہاتھ سر پر رکھے اس تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھی تھیں جو آگے چلنے سے قطعاً معذور ہو۔ عذرا کے آتے ہی سلمٰی کے آنسو ایک بار پھر تیزی سے بہنے لگے اور ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ ماں نے بھی سرد آہیں بھر بھر کر پھر سے بڑبڑانا شروع کر دیا جس میں نہ معلوم کیسی کیسی فریادیں اور شکایتیں پوشیدہ تھیں۔

عذرا بے چاری کبھی ماں کو حیرت سے دیکھتی اور کبھی بیٹی کو۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا یہ کیا قصہ ہے۔ آخر کار اس کے بار بار پوچھنے پر سلمٰی کی ماں نے ساری رام کہانی سنائی اور پھر اس کو پاس بٹھا کر بڑی منت سے کہا،

"عذرا بیٹی! یہ آگ تیری ہی لگائی ہوئی ہے، تو ہی کسی طرح اس کو بجھا۔ میری تو یہ سیدھی سی بات اس کی موئی عقل میں نہیں بیٹھتی کہ اس وقت تو نام کٹوا کر معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے، اگر یہ سلسلہ چلتا رہا اور خدا نہ کرے ان لوگوں کو علم ہو گیا اور لڑکے کے دل میں شیطان کے کان بہرے، ذرا سا بھی وہم آ گیا تو تمام عمر شک و شبہ اور وہم کی بلا کو ہم ہی دونوں تو بھگتیں گی اور نہیں تو کون بیٹھا ہے مجھ بے کس بیوہ اور اس یتیم کا جو دکھ بٹائے گا۔"

عذرا نے بڑی حجتوں اور بحث کے بعد بڑی مشکل سے سلمٰی کو تو ماں کا کہنا ماننے پر راضی کر لیا، لیکن خود بڑے بوجھل دل اور تھکے تھکے قدموں سے گھر پہنچی۔ اس کا دل اس دن کالج جانے کو نہ چاہا۔ وہ تقریباً سارا دن اپنے کمرے میں پڑی اس ہولناک وہم کے متعلق سوچتی رہی جس نے عورت کی آزادی اور انسانیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔ "عورت نے اس وہم کے پیچھے دنیا تج دی"، اس نے سامنے کھلی ہوئی کتاب پر سے نظریں ہٹا کر بڑے کرب سے سوچا۔ "خود کو ایک چہار دیواری میں مقید کر کے زندہ در گور کر لیا، دنیا کی ہر نعمت، لذت، راحت، آزادی اور خود مختاری کو بھول کر وہم کے دیوتا کی پرستش کی اور اپنی مفروضہ عزت کی قربان گاہ پر ایسی ایسی قربانیاں دیں جن سے انسانیت بھی لرز اٹھی مگر نتیجہ کیا رہا؟ وہ جتنا جتنا خود کو مٹاتی رہی دوسرے مزید کا نعرہ بلند کرتے رہے"۔ اور اس نے خیالات کی تلخی سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، اور جیسا کہ ساس نے وعدہ لیا تھا، ڈھائی ماہ کے اندر اندر سلمیٰ زندگی کے سب سے سخت امتحان کے لئے سسرال پہنچ گئی۔

ماں یوں تو اس بھاری فرض سے سبکدوش ہو کر قدرتی طور پر خوش اور مطمئن تھی، مگر بے چاری کو ایک دکھ ضرور تھا کہ سلمیٰ کی سسرال بہت دور تھی! اور ان کے پاس کوئی ایسا بھروسہ کا آدمی نہ تھا جسے بھیج کر سلمیٰ کو بلوا لیا کرتیں۔ داماد صاحب کی زمینداری کا کام پھیلا ہوا تھا اور وہ اتنے مصروف تھے کہ ان کے لئے ایسے "معمولی" کاموں کے لئے وقت نکالنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلمیٰ بڑی مشکل سے سال بھر کے بعد ہی ماں کے پاس آسکی تھی، اور اب پورے تین مہینہ بعد واپس جا رہی تھی، اور وہ بھی اس طرح کہ سلمیٰ کے ضعیف العمر سسر کو خود اسے لینے آنا پڑا تھا۔

عذرا جس وقت سلمیٰ سے ملنے اس کے ہاں پہنچی تو سلمیٰ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ ابھی حال ہی میں تو وہ میعادی بخار سے اٹھی تھی۔ سامان سمیٹنے باندھنے نے اس کو بہت ہی تھکا دیا تھا۔ عذرا نے ایسی حالت دیکھی تو کہنے لگی: "ایسی جانے کی کیا مصیبت آگئی، ذرا ٹھہر کر بھی جا سکتی تھیں۔"

"مصیبت ہی تو ہے!" یہ کہہ کر سلمیٰ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"مصیبت تو تم نے خود ہی پیدا کر رکھی ہے!" عذرا حسبِ عادت بول اُٹھی۔ "حالت جب یہ ہے تو کیوں نہیں تنہا آنے جانے کی عادت ڈال لیتیں۔ مزے میں جب چاہا آ گئے، جب چاہا گئے۔"

"اُوئی بیٹی! اب تم اکیلے دو کیلے سفر کی لگا دو۔" سلمیٰ کی ماں عذرا کی یہ بات سن کر جلبلائیں۔

"میں تو پہلے ہی اس کے ضدی مزاج سے ہول کھائے ہوئے ہوں۔ جانتی ہو بیٹی، داماد کس بلا کے وہمی ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ تم بیچاری لڑکیاں کیا جانو، اللہ ہی بچائے، ہر عورت کو وہمی مرد سے۔ اور بُرا اچھی بات تو یہ ہے کہ مرد بچے ہوتے ہی شکی ہیں۔ یہ تو بس عورت کی خوبی ہے کہ وہ مرد کو شک کا موقع ہی نہ دے۔ میں تو اس کو ہر دم یہی سمجھاتی ہوں کہ بیٹی کوئی ایسی ویسی بات نہ ہونے پائے۔ اب یہی پچھلے دنوں کی بات لو، اس کے آنے میں دیر ہوئی، میری طبیعت بھی خراب رہی۔ اُس نے کئی بار لکھا، "اماں یوں آجاؤں، وُوں آجاؤں"، میں نے ہر بار یہی جواب دیا، "بیٹی

بس صبر سے بیٹھی رہو اور جو وہ کہے وہی کرو۔"

بڑی بی نہ معلوم اپنی دھن میں کیا کیا کہے جا رہی تھیں اور خدا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر ان کو ہی نہیں ہر عورت کو بتائے کہ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں اور تم اجوا کچھ کرو یہ نئی تمہاری زندگیاں ایک ہی ڈھرے پر چلتی رہیں گی لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکی،

"خالہ جان، میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ سلمیٰ ابھی کمزور ہے، سفر کے قابل نہیں۔" "ہاں بیٹی، کمزور تو ہے مگر کیا کریں، سزیاں سر پر کھڑی ہیں اور اس کے سسر اتنے ضعیف ہیں کہ لاری میں سفر نہیں کر سکتے اور بیٹی سفر بھی ایسا گوڑا کالے کوسوں کا جس میں گاڑی بھی بدلی جاتی ہے۔"

سلمیٰ جو ایک گاڑی سے اتر کر گھنٹہ بھر سے دوسری گاڑی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی، گاڑی کی آواز سنتے ہی بٹوہ سنبھال کر نقاب درست کرتی ہوئی مسافر خانہ کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ رات خنک بھی تھی اور ڈراؤنی بھی، کیونکہ بادل گھرا ہوا تھا اور بجلی چمک رہی تھی۔ کئی منٹ گزر جانے پر بھی جب سسر اس کو نظر نہیں آئے تو اس نے مسافر خانہ کی مائی کو باہر بھیجا۔ مائی گھبرائی ہوئی الٹے قدموں واپس آئی اور سلمیٰ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے کھینچتی ہوئی باہر لے چلی، وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ سلمیٰ جب مردانے مسافر خانہ پہنچی تو وہاں کئی آدمی جمع تھے اور اس کے سسر ایک کوچ پر سیدھے پڑے تھے۔ لوگوں کی باتوں سے اور پھر نبض سے اس کو معلوم ہو گیا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ سلمیٰ نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن بیماری کی کمزوری پر اچانک صدمہ برداشت نہ کر سکی اور وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

مارے نقاہت کے اس سے ہلا بھی نہ جا رہا تھا، پھر بھی بڑی کوشش سے اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک معمولی سے بستر پر پڑی ہے۔ کمرہ بھی بے حد سادہ تھا، نہ تو ہسپتال کا معلوم ہوتا تھا اور نہ کسی گھر کا۔ اس نے ایک بار اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو ایک تپائی پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ عورت سلمیٰ کو ہوش میں دیکھ کر جلدی سے اس کے قریب آئی اور اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ مسافر خانہ کی وہی مائی ہے اور یہ گھر اسٹیشن ماسٹر کا ہے

سلمیٰ کو یہ سُن کر بہت کچھ یاد آگیا۔ وہ گھبرا کر بستر سے اُٹھنے لگی، مگر فوراً ہی کسی اجنبی کو کمرے میں آتے دیکھ کر جھجک کر تکیہ پر دوہری ہو گئی۔ یہ اسٹیشن ماسٹر تھے۔ انھوں نے سلمیٰ کو بتایا کہ وہ تین دن سے بے ہوش تھی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے اُسے شہر کے ہسپتال تک نہیں پہنچایا جا سکا تھا اور چونکہ اس کے سامان میں ہر ممکن تلاش کے باوجود بھی اس کا پتہ نہ مل سکا تھا اس لئے اس کے گھر والوں کو بھی اطلاع نہیں دی جا سکی تھی۔ سلمیٰ کو آخری بات نے سخت بوکھلا دیا۔ اس کے شوہر کو اطلاع دی گئی۔ ان کے پہنچنے تک کا وقفہ اس کے لئے اذیت ناک تھا اور پھر جیسے ہی شوہر نے کمرے میں قدم رکھا، وہ دیوانوں کی طرح اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سلمیٰ کی توقع کے برعکس شوہر نے صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہایت سنجیدگی بلکہ رُکھائی سے اس کے آنسو پونچھے اور صرف اتنا کہا: "اسٹیشن ماسٹر غالباً تمہارے کالج وغیرہ کا ساتھی ہوگا۔ جبھی بے چارے نے اتنا خیال کیا۔"

"نہیں تو، میں تو اس کو پہچانتی تک نہیں۔" اس نے شوہر کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"خیر ٹھیک ہے۔" انھوں نے اسے عجیب انداز میں تسلی دی، لیکن وہ یہ دیکھ کر سہم گئی کہ شوہر کی آنکھوں میں ہمیشہ نظر آنے والی محبت کی جگہ عجیب سی بدگمانی نے لے لی ہے۔

"اب تم واپسی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ فخرو (پرانا ملازم) میرے ساتھ آیا ہے، وہ تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔ فی الحال تمہارا میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ تم کمزور ہو اور مجھے تجہیز و تکفین وغیرہ کا بھی انتظام کرنا ہے۔ اچھا اب تم تیار ہو جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلے گئے اور اس کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو گھما کر ہوا میں اچھال دیا ہو۔ وہ چکرا کر بستر پر گر پڑی —— موتی کی آب اتر چکی تھی۔ اتفاق کے بے رحم ہاتھوں نے اس کو کیچڑ میں گرا دیا تھا۔ اب خاک دھول ہٹا کر کون دیکھے کہ آب و تاب اب بھی اسی طرح ہے اور اگر کوئی دیکھ بھی لے تو واہمہ کا بھوت سوچنے سمجھنے کی قوت ہی کب باقی چھوڑتا ہے۔

اس حادثہ کے بعد وہ ماں کے ہاں بھیج دی گئی تھی اور چھ سات ماہ میں مشتبہ خطوں،

پانو دائیوں اور التجاؤں کے نتیجے میں اس کے شوہر کا ایک طویل خط آیا تھا۔ عذرا اس کی دل دہی اور دل جوئی اس اندوہگیں ماحول میں سلمیٰ کو زندہ دیکھ رہی تھی، اس خط کو نہ معلوم کتنی دفعہ پڑھ چکی تھی، ہر بار اس کی نگاہیں خط کے ان الفاظ پر اٹک کر رہ جاتی تھیں، "۔ ۔ ۔ میری والدہ بھی تمہیں یہاں بلانے پر مُصر ہیں، مگر مصلحت اسی میں ہے کہ تمہارا قیام فی الحال وہیں رہے۔ تمہارے متعلق جو عام رائے ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ میری پوزیشن بھی اچھی نہیں۔ صورتِ حال کی نزاکت کا تمہیں بھی اندازہ ہے۔ یقین ہے تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گی جس سے مجھ پر اور تم پر حرف آئے۔"

اس خط میں سلمیٰ کے لئے ہمدردی یا تسلّی کا ایک لفظ بھی نہیں تھا اور عذرا یوں سمجھ رہی تھی کہ تسکین اور تسلّی کے تمام الفاظ اپنا اثر کھو چکے تھے۔ دونوں ماں بیٹی کا غم بہلانا اب اس کے بس میں بھی نہ رہا تو اسے نہ معلوم کیوں غصہ آنے لگا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان دونوں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھے کہ "عورت تو اس وہم کی چکی میں نہ معلوم کب سے پستی چلی آ رہی ہے اور نہ جانے کتنی عورتیں اب تک اس میں پس کر سرمہ بن چکی ہیں۔ اگر تم دو بے کس عورتوں کی ہڈیوں نے اس سرمہ میں اضافہ کر دیا تو کونسا حشر برپا ہو جائے گا؟"

عذرا نہ تو کچھ کہہ سکی اور نہ کچھ پوچھ سکی۔ وہ جلنے والے دلوں کی چنگاریوں اور سلگتی ہوئی آہوں کے دھوئیں سے وہی نہیں آہستہ آہستہ طاری ہوتی ہوئی سیاہ رات بھی سہمی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

بیوی کا انتخاب

(ریڈیائی ڈرامہ جو ۱۹۴۰ء میں شملہ میں لکھا گیا'
اور آل انڈیا ریڈیو' دہلی سے کئی بار نشر ہوا)

(فاخر کا کمرہ)

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

آپا : فاخر، فاخر! میں آسکتی ہوں کیا؟

فاخر : ضرور، ضرور —— (دروازہ کھلنے اور آپا کے اندر آنے کی آواز) ——
مگر آپا، اُس اپنی رام کہانی کو ذرا ....

آپا : ذرا پھر کہہ لوں۔

فاخر : لاحول ہے آپا۔

آپا : ہو سکتی ہے، آپا لاحول ہو سکتی ہے، مگر اپنے بھائی کی دشمن نہیں ہو سکتی کہ بے سوچے سمجھے ......

فاخر : او ہو رے سمجھ ہماری آپا کی! شاعر کی یہ موٹی سی بات نہیں سمجھ سکتیں —ع
نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی۔

آپا: بھائی تم کو کیسے مجھے اور امی کو تمہاری طبیعت کا پتا تو نہیں؟

فاخر: بھائی مگر اتنا ضرور نہیں کہا اس زندگی کے سب سے بڑے سوال کو چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو میں تم لوگوں کا صرف یہ کہنا ہے!

آپا: ہم ایک دفعہ چھوڑ کر دوبارہ خود دکھائیں۔ مگر لڑکی والے بھی مانتے ہیں۔ ہم تو اس معاملہ میں بالکل بے بس ہیں۔

فاخر: تو پھر اس جھگڑے میں پڑنے سے فائدہ۔ اچھی لڑکی کسی کو مبارک!

آپا: اچھی کو کیوں مبارک ہو؟ کسی نے کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔ سب تم جیسے تو نہیں ہوتے۔ لڑکی کے لئے کہو ہزار ملیں ایک۔

فاخر: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہزار ملیں گی کیا لاکھوں میں ایک۔ ہوئی نہ تمہاری سہیلی!

آپا: ہوئی میری سہیلی۔ دیکھو تو ہوش اڑ جائیں۔ ایسی خوبصورت آئی تعلیم یافتہ اور اس قدر خوش مزاج لڑکی ہے کہ میں کیا کہوں۔ بس جی نہیں چاہتا کہ کسی اور کے گھر جائے۔

فاخر: تو مت جانے دو۔

آپا: میرے نہ جانے دینے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے بس میں اس کو جانا ہوتا تو کبھی کا بیاہ چکی ہوتی۔

فاخر: آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔ اسی طرح اگر بہو لانے کا شوق ہے تو میں کہتا ہوں فرخ سے کیوں نہیں کر لیتیں۔ سیدھی سی ترکیب ہے ایک پنتھ دو کاج۔

آپا: ترکیبیں تو سبھی سیدھی ہیں مگر ہماری جان کرنہ دو گے۔

فاخر: آپا میں تو کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہے دیتا ہوں۔ بغیر دیکھے کروں گا یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

آپا: کوئی روگ ایسا نہیں جو بس کا نہ ہو۔ کرنے کو فرخ کی بھی ہے ورنہ تمہاری طبیعت بھی نہیں۔ مگر فاخر یہ تو فرخندہ تمہارے ہی لائق ہے۔ صرف تمہارے جیسے ہی نے جوڑی اتاری ہو۔

فاخر: میں نہیں سمجھ سکتا کہ فرخ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ صرف کوئی سال دو سال کا!

آپا : توبہ ہے، اس کو کون کہہ رہا ہے، میں تو شکل صورت کو کہتی ہوں ـــــ شکل صورت کو!

فاخر : شکل صورت تو دیکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے!

آپا : تو میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں؟

فاخر : اور میں بھی نابینا نہیں، پھر کر دیکھئے کوشش۔

آپا : تم سمجھتے ہو ہم نے کوئی کسر چھوڑی ہوگی، اپنی سی سبھی کر لی، مگر لڑکی والے بھی ایسے حضرت ہیں کہ جب سے یہ بھنک کان میں پڑی ہے، فرخندہ کو اِدھر بھیجنا ہی چھوڑ دیا۔

فاخر : تو پھر مجبوری ہے۔

آپا : فاخر میں کہتی ہوں کہ زیادہ بچپن نہ کرو۔

فاخر : آپ بھی مجھے ہی کہے جاتی ہیں، آپا۔ اُن جاہل والدین کو بھی تو جا کر سمجھائیے، جو اپنی لڑکی کے لئے اتنی سی بات بھی نہیں کر سکتے۔

آپا : ولایت جا کر تمہارا تو سر پھر گیا ہے، آخر سوچو تو، وہ بھی شریف ہیں، کچھ عزت رکھتے ہیں، بیٹی ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ بے ننگ و ناموس ہو گئے۔ فرض کرو کہ تم نے دیکھ کر انکار کر دیا تو اُن کی کیا رہ جائے گی! اور پھر ایسا تو وہ جب کریں جب انہیں غرض ہو، اِس وقت غرض تو زیادہ ہمیں ہے۔

فاخر : اِنہیں باتوں نے تو اُن کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا، اُنہیں غرض نہیں تو ہمیں بھی نہیں! ـــــ نہ جانے اِن ہندوستانی لڑکیوں میں کیا لال لگے ہوتے ہیں کہ نظر پڑ ہی نہیں اور . . . .

آپا : پھر لگے وہی بے تُکی ہانکنے۔ میرے پاس بحث کے لئے وقت نہیں، مجھے امّی کو بتانا ہے کہ تم نے کیا فیصلہ کیا۔

فاخر : کیسا فیصلہ؟

آپا : تمہیں نہیں معلوم کہ کیسا فیصلہ؟

فاخر : آپا، میری زبان سے بار بار انکار سُننے سے حاصل؟

آپا: افسوس تمہاری عقل پر ــــــ تو پھر کریں فرخ کے لئے کوشش؟
فاخر: ضرور، ضرور!

(فیروزہ کا کمرہ)
(فیروزہ گنگنا رہی ہے: "من دھیرے دھیرے رونا")
(فرخندہ کے آنے کی آواز)

فیروزہ: ارے، تم کیسے بھول پڑیں فرخندہ! اچھی تو رہیں سسرال جانے کی کیا بندش ہوئی سبھی جگہ آنا جانا چھوڑ دیا۔
فرخندہ: (دھیمی آواز میں) ــــــ کیسی سسرال؟
فیروزہ: کیا بھولی بنتی ہو! ہمارا وہاں آنا جانا نہیں، مگر جو بات ہوتی ہے کان میں تو سبھی کے پڑ جاتی ہے۔
فرخندہ: آخر ایسی کیا بات پڑی تمہارے کان میں، کچھ معلوم تو ہو۔
فیروزہ: اللہ اللہ، بننے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ فاخر بھیا سے تمہاری نسبت طے نہیں ہو گئی!
فرخندہ: سبحان اللہ، یہ تمہیں کس نے بہکا دیا۔
فیروزہ: زیادہ نہ اُڑاؤ۔
فرخندہ: بے پر کی خود اُڑا رہی ہو اور کہتی ہو مجھے۔
فیروزہ: ارے یہ تم ایک دم زرد کیوں ہو گئیں، ایسا دولھا تو کسی ہی خوش قسمت کو ملتا ہے۔ میں نے اُن کو دیکھا تو کبھی نہیں، مگر سنتی ہوں کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ شکل میں تو کوئی اُن کا ثانی نہیں، اور پھر انگلینڈ ریٹرنڈ ہیں۔
فرخندہ: (ہنستے ہوئے) ــــــ تم تو نادیدہ عاشق ہو گئیں۔ ایسا ہی ہے تو پھر تم ہی کر لونا!
فیروزہ: میں تو سو دفعہ کر لوں بہن، مگر ہم جیسے کالے کلوٹوں، بدصورتوں سے کوئی کرتا بھی ہو۔

فرخندہ : بدصورت ہوں تمہارے دشمن، مگر وہ تو بہن خوبصورتوں سے بھی نہیں کرتے۔

فیروزہ : ہاں، تمہارے آگے انہیں اور کوئی خوبصورت لگے ہی کاہے کو!

فرخندہ : نہ جانے کیا بکے جارہی ہو! تمہیں نام کا دھوکہ ہوا ہے۔ فاخر نہیں، فرخ کہو فرخ۔

فیروزہ : (حیرت سے) —— سچ کہتی ہو بہن، مذاق نہیں، ہم نے تو فرخ بھیا کو سنا تھا۔

فرخندہ : (ہلکی سی آہ کے ساتھ) —— ٹھیک سنا تھا تم نے، مگر اب تو فرخ ہی کہو۔

فیروزہ : (متاثر ہوکر) —— صاف صاف کہو فرخندہ، آخر معاملہ کیا ہے؟ تم تو پہیلیاں سی بجھا رہی ہو۔ اور یہ چہرہ بھی اس قدر اترا اترا سا ہے!

فرخندہ : (بیزاری سے) —— معاملہ ہی کیا ہوتا، کوئی بات بھی تو ہو کہنے کی۔ ایک نے انکار کردیا، اس لئے دوسرے سے طے ہوگئی —— (سوکھی ہنسی)۔

فیروزہ : واہ کیا خوب، آخر یہ کیوں؟

فرخندہ : یہ کیوں کی بھی ایک ہی رہی۔ کیا، بہن، لڑکوں کی مرضی میں بھی چوں چرا کو دخل ہوتا ہے۔

فیروزہ : مگر انکار کی کوئی وجہ بھی؟

فرخندہ : (سکون سے) —— دیکھنا چاہتے تھے۔

فیروزہ : (جوش سے) —— ارے، یہ بھی کوئی مشکل بات تھی۔ فاخر بھیا کی آپا تو تمہاری بھی آپا ہوتی ہیں، دکھا دیا ہوتا کسی دن چھپ کر۔

فرخندہ : ایسا ہوسکتا تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔

فیروزہ : تو پھر فرخ سے ہونے لگی؟

فرخندہ : سنتے تو ایسا ہی ہیں۔

فیروزہ : (ٹھنڈی سانس لے کر) —— بچاری لڑکیاں گائے ہوتی ہیں گائے، جس کو

رشتے کی دادی اُسی کے پیچھے ہو لیں۔

فرخندہ: ٹھیک کہتی ہو بہن۔

فیروزہ: سچ کہو فرخندہ تمہیں افسوس تو نہیں —— (رُک کر) —— ضرور ہے، معلوم ہوتا ہے تم نے انہیں دیکھ رکھا ہے۔

فرخندہ: اب ہٹاؤ بھی اس قصّے کو، یہ دیکھوں، یہ کیا بُنا جا رہا ہے؟

فیروزہ: کچھ نہیں، سوئٹر ہے۔ تم تو اپنی بات بتاؤ، کیا واقعی فاخر بھیا کو دیکھ رکھا ہے؟

(فیروزہ کی ماں ۔ دُور کی آواز)

ماں: فیروزہ، فیروزہ، سنتی ہو بٹیا! ذرا دو ایک پان تو بنا کر یہاں دے جاؤ۔

فیروزہ: (اونچی آواز میں) —— بہت اچھا، امّی جان —— (فرخندہ سے) —— ابھی فرخندہ، بنا دینا ذرا دو ایک پان جھٹ پٹ، میں ذرا یہ دس بارہ خانے گر پڑے ہیں۔ ان کو اٹھالوں —— (پاندان کی کھٹر پٹر) —— بھئی ذرا لپک کر دے بھی آؤ، میری تو سلائی پوری ہونے ہی میں نہیں آتی۔ اور پھر وہی باتونی چچا آئے ہوں گے، ایسا پکڑ کر بٹھائیں گے کہ ایک گھنٹہ سے پہلے اٹھنا محال ہو جائے گا۔

(فرخندہ کی سیڑھیاں اُترنے کی آواز جس کے
ساتھ ساتھ یہ آوازیں صاف ہوتی جاتی ہیں)

ماں: ہاں میاں، کہاں ہم غریب کہاں تم۔ میں نے تو بہت میل جول کرنا چاہا، مگر تمہاری اماں نے شاید پسند نہیں کیا۔ اب یہی دیکھ لو، اس شہر میں ہمیں تمہیں رہتے اتنا عرصہ ہو گیا، مگر آج پہلی بار تم نے اِس گھر میں قدم رکھا ہے۔ وہ بھی خدا بھلا کرے ناصر کا، اگر تمہاری کتابیں نہ لاتا تو اب بھی نہ آتے۔

فاخر: خالہ جان، میں تو مدّت سے یہاں تھا ہی نہیں، اور اماں جان کو کچھ فرصت بھی کم ہوتی ہے۔

(فرخندہ کے آنے کی آواز)

ماں : یہاں رکھ دو' بیٹا' تپائی پر۔

(تھالی رکھنے اور فرخندہ کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز
جس کے ساتھ ساتھ یہ آوازیں مدھم ہوتی جاتی ہیں)

ماں : لو بیٹا' پان کھاؤ' اطمینان سے بیٹھو' ناصر آتا ہی ہوگا۔

فاخر : (بے چین آواز میں) —— بہت تکلیف کی آپ نے۔ اچھا اب اجازت دیجیے' پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔

فیروزہ : (فرخندہ کو دوڑ کر آتا دیکھ کر) —— اُوئی توبہ ہے' یہ اس قدر سانس کیوں چڑھا لیا' چچا جان تمہیں تھوڑی پر دُکر بٹھاتے۔

(فاخر کا کمرہ)

فاخر : ارے وہی جن کا لڑکا ناصر کبھی میرے ساتھ پڑھتا تھا۔

آپا : (چیخ کر) —— فاخر' تمہارا سر تو نہیں پھر گیا۔

فاخر : قطعی نہیں' سر کیسے پھر سکتا ہے میرا۔

آپا : یہ تو سر پھروں ہی کی سی باتیں ہیں۔ دیکھا ہے تم نے فیروزہ کو؟

فاخر : (ذرا سوچ کر) —— ہاں ٹھیک ہے۔ فیروزہ ہی ہے اُس کا نام' اور میں نے اپنی آنکھوں سے اُس کو دیکھا ہے۔

آپا : دیکھا ہے' خاک پڑے تمہارے دیکھنے پر! آخر کیا دیکھا تم نے اُس میں؟

فاخر : (شوخی سے) —— دو آنکھیں' دو کان' ایک ناک' دو ہاتھ' دو پاؤں —— کہئے' کافی ہے' یا کچھ اور بتاؤں۔

آپا : (بیزاری سے) —— یہی دیکھنا تھا تو دیکھنے کی شرط ہی کیوں کی تھی۔

فاخر : تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے کی شرط کے معنی یہ تھے کہ میں لڑکی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی آٹھواں عجوبہ دیکھنا چاہتا تھا۔

آپا : بند کرو بکواس، پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ مجھے خوبصورت نہیں چاہیئے، ہم کسی اچھی جگہ معمولی شکل صورت کی لڑکی تلاش کر دیتے۔

فاخر : گویا فیروزہ بدصورت ہے۔

آپا : (طنزاً) —— نہیں، بڑی حسین ہے۔ دیکھا نہیں تم نے ناصر کو، اور وہ تو ناصر سے بھی کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ گلاب نے تو اُس کو دیکھ کر کھلنا ہی چھوڑ دیا ہے!

فاخر : بے شک! جبھی تو کہتا ہوں کہ تم عورتوں کا مذاق نہایت ہی بھونڈا ہوتا ہے۔ جس کا رنگ ذرا سفید دیکھا پاگل ہو گئیں۔ اور کسی چیز پر نظر ہی نہیں جاتی....

آپا : فاخر!

فاخر : (بات جاری رکھتے ہوئے) —— اور یہ غریب ناصر کی بھی ایک ہی رہی۔ کیا بدصورت بھائیوں کے خوبصورت بہنیں، اور بدصورت بہنوں کے خوبصورت بھائی، نہیں ہو سکتے؟

آپا : عقل اپنی ماری گئی ہے، مذاق بتلاتے ہو بھونڈا عورتوں کا۔

فاخر : (طنزاً) —— جی ہاں، عورتیں —— ارے عورتیں اپنی سہیلیوں سے اچھا کسی کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ اور جس سے بُرائی ہوئی، بس —— پھر اُس غریب کا دُنیا میں کہیں ٹھکانہ نہیں!

آپا : (حیرت سے) —— اب تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔

فاخر : (تیزی سے) —— سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

آپا : تم وہاں گئے کیوں؟

فاخر : (مصنوعی سنجیدگی سے) —— اِس لئے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ خاندان کی تعزیرات میں یہ کوئی جُرم ہے!

آپا : توبہ ہے تمہارے بے تُکے پن سے۔ میں تو صرف پوچھ رہی تھی کہ کیوں گئے تھے، کیا کام تھا۔

فاخر : کام تمام میرا اثر گیا تھا وہاں کتابیں لینے ناصر سے۔ فیروزہ پان لے کر آئی تھی۔

آپا : کیسے بے شرم لوگ ہیں، پہلی ہی بار لڑکی کو سامنے کر دیا۔

فاخر : (شوخی سے) —— واقعی عجیب بے وقوف ہیں !

آپا : اچھا، اب تمہارا مطلب ؟

فاخر : مطلب یہی کہ شرط میری پوری ہو گئی۔

آپا : مگر یہ بات میرے بس کی نہیں۔

فاخر : (بے قراری سے) —— کیوں ؟

آپا : اس لئے کہ مجھے یہ احساس پاگل بنا دے گا کہ میں تمہاری زندگی خراب کر رہی ہوں۔

فاخر : نہ جانے آپ کو بعض وقت کیا ہو جاتا ہے۔ زندگی تو میری ایسے خراب ہو جائے گی۔

آپا : فاخر، آدمی بنو، آدمی !

فاخر : واقعی آپا، میں اس سے زیادہ آدمی کبھی نہیں بنا، بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ بالکل....

آپا : (کچھ توقف سے) — اچھا بھئی، اس میں حجت ہی کیا ہے۔ تمہاری رائے اور خوشی مقدم ہے۔

فاخر : وہ لوگ راضی ہو جائیں گے نا ؟

آپا : (تیزی سے) — تمہاری طرح سر پھرا ہو گا تو نہیں ہوں گے۔ (رک کر) — میں خواہ مخواہ ہی مری جا رہی ہوں۔ امی تو سن کر نہال ہو جائیں گی۔ ان کو ایک طرف تو یہ وہم کھائے جاتا ہے کہ فاخر شادی نہیں کرے گا، اور دوسری طرف یہ کہ فرخندہ والے شادی پر زور دے رہے ہیں، بڑے کو چھوڑ کر چھوٹے کی شادی کریں ! اب دونوں کی ساتھ ہو جائیگی۔

فاخر : اور ہمارے دن پھر جائیں گے۔

(کچھ دن بعد)

(فاخر اور فرخ کا مکان)

(شادی کی دھوم دھام، شور و غوغا، چیخ پکار)

آپا : فاخر، فاخر، یہ کہاں بھاگے پھر رہے ہو، یہ وقت ہو گیا ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔

فاخر : (خوشی کے لہجہ میں) —— فرمائیے، فرمائیے، آپا جان —— فرمائیے۔
آپا : میں کہہ رہی تھی بھاوج کو رونمائی نہ دو گے۔
فاخر : اچھا، فرخ نے میری بیوی کو کیا دیا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟
آپا : اُس کا کیا ہے، وہ چھوٹا ہے۔ پہلے تمہیں دینا ہے، پھر اُسے۔
فاخر : میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ جو اُس نے دیا ہوگا میں اُس سے کچھ زیادہ دے دونگا،
تاکہ چھوٹے بڑے کی تمیز رہے۔
آپا : (ہنستے ہوئے) —— کسی وقت اپنی باتوں سے باز نہیں آتے۔ چل چکو،
مجھے دیر ہو رہی ہے۔
فاخر : چلئے، مگر میں عورتوں کے طوفان میں نہ جاؤں گا۔
آپا : آؤ بھی، اس وقت دونوں دلہنیں کمرے میں ہیں۔
(جانے کی آواز)
آپا : فرخندہ دُلہن، جیٹھ کو سلام کرو۔
فاخر : (حیرت سے) —— آپا، میری ہی بیوی اور مجھی سے رونمائی!
آپا : (ڈانٹتے ہوئے) —— یہ کیا بے ہودگی ہے، مذاق کے لئے وقت دیکھتے ہو
نہ موقع!
فاخر : (زیادہ حیرت سے) —— واہ ری ہماری آپا، مذاق میں کر رہا ہوں یا آپ!
آپا : (تیزی سے) —— مجھے کبھی مذاق کرتے دیکھا بھی ہے؟
فاخر : (چڑھے ہوئے سانس اور گھٹی ہوئی آواز سے) —— مگر آپا یہ تو
فیروزہ ہے۔
آپا : کیا پاگل پنے کی باتیں کرتے ہو، فیروزہ دُلہن تو یہ ہے، لو دیکھو!
فاخر : (ہچکی اور چیخ سے مشابہ آواز میں) —— آپا . . . . .
آپا : ہٹو بھی، وہ گرمی سے فرخندہ دُلہن بے ہوش ہو گئیں!

ویلج کوتوال

(جنوری ۱۹۷۱ء میں "اردو ڈائجسٹ" لاہور کے لئے
لکھا گیا، اور مارچ نمبر میں بہ تلخیص شائع ہوا)

وکالت کرتے ہوئے مجھے سات آٹھ سال ہو گئے، لیکن ایسا کوئی مقدمہ ابھی تک نظر سے نہیں گزرا جیسا ایک واقعہ ملازمت کے دوران پیش آیا۔ تیس سالہ ملازمت میں سے کم و بیش پندرہ برس میرے پارلیمانی ڈرافٹنگ کرتے گزرے۔

پارلیمانی ڈرافٹنگ ہر قانون داں کے بس کا روگ نہیں ہوا کرتا، اور اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اکثر وکیل اپنے آپ کو ڈرافٹسمین کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی وکلاء نے بنیادی جمہوریتوں کے باب میں طبع آزمائی کی، اور جب مجوزہ قانون کا ایک ڈھانچہ سا تیار ہو گیا، تو قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ میں اُس وقت وزارتِ قانون میں حکومتِ پاکستان کا ڈرافٹسمین تھا۔ موضوع نہایت فرسودہ تھا۔ انواع و اقسام کے قوانین سالہا سال سے رائج تھے، اور ان کی چھان بین کئے بغیر کوئی تشفی بخش ڈرافٹ آرڈر پیش کرنا قطعاً غیر ممکن تھا۔

ایسے موقعوں پر دو قسم کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، اوّل ایک ایسے اسسٹنٹ

کی جو چُوہے کی طرح بلوں میں گھس کر مروجہ قوانین کے بال کی کھال تک کھینچ لائے۔ دوسرے ایک ایسے ماہر کی جو ان قوانین پر عملدرآمد کرتا کراتا رہا ہو، اور دائرہ عمل میں ان کی اونچ نیچ سے کماحقہ، واقف ہو خصوصاً ان کے عیوب سے، تاکہ مجوزہ قانون کو پرانی لغزشوں سے پاک رکھا جا سکے۔ اسسٹنٹ تو بفضلہٖ کئی تھے، لیکن اسے بنیادی جمہوریتوں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ مغربی پاکستان کی حکومت نے ایک ایسے افسر کو لاہور سے کراچی بھیجا جو بیک وقت دونوں خصوصیتوں کے حامل تھے، اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے معاملات میں دُور دُور اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

"آپ تو ان قوانین کے حافظ معلوم ہوتے ہیں"، میں نے ابتدائی گفتگو کے بعد اُن سے کہا۔

"آپ کے اس ریمارک کا شکریہ، میری تو ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔"

"اِن قوانین کے علاوہ، جن کی بقرعید زیادہ دُور نہیں دِکھائی دیتی، آپ کو شعر و شاعری سے بھی خاص شغف معلوم ہوتا ہے۔"

"شعر سے زیادہ اور شاعری سے کم! مگر معاف کیجئے، یہ آپ نے کیا فرمایا، کہ اِن قوانین کی بقرعید دُور نہیں دکھائی دیتی؟"

"یعنی یہ کہ ان کو کالعدم کر کے مجوّزہ بنیادی جمہوریتوں کے آرڈر کو جلد نافذ کیا جائے گا۔"

"اچھا، یہ مطلب۔ تو پھر شاعر تو آپ ہوئے۔"

مسعود الحسن صاحب کے ساتھ جو چند دن اُس وقت گزرے وہ کبھی نہیں بُھلائے جا سکتے۔ یہ غالباً انہی کی ذات بابرکات کا ایک کرشمہ تھا کہ بنیادی جمہوریتیں، باوجود اپنی بدنامیوں کے، اس قدر نیک نام تھیں کہ ہر شریف آدمی بی، ڈی ہونے کا

خواہشمند رہتا تھا۔ اب ایسا نہ ہو، یہ اور بات ہے! ایک آدھ روز کی گفت و شنید اور تبادلہ خیالات کے بعد جب ذرا کھلے تو کہنے لگے:

"ایک رات خواب میں اللہ تعالیٰ دکھائی دیے، تو . . . . . ."

"یعنی اللہ تعالیٰ —— بذاتِ خود!"

"جی ہاں، اُن سے کافی باتیں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں۔"

"باتیں، اللہ تعالیٰ سے —— آپ کی —— ہوئیں —— اور ہوتی رہتی ہیں!" —— میں کچھ خوفزدہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی ہاں، تو آپ نے کیا سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا جلوہ بجز موسیٰؑ کے اور کسی کو دیکھنے کا حق نہیں۔"

"جی —— اللہ تعالیٰ کا جلوہ۔" تو کیا آپ بھی غش کھا گئے۔ کیسا تھا جلوہ اللہ تعالیٰ کا؟"

"نورٌ علیٰ نور —— کمرہ روشن ہو گیا۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ! تو آپ تو بڑی برگزیدہ ہستی ہوئے۔ مگر مجھے تو آپ سے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ نہ معلوم یہ ڈرافٹ مکمل ہو سکے گا یا نہیں۔"

"سب ہو جائے گا، آپ اس کی فکر نہ کریں" —— مسعود الحسن صاحب نے مجذوبانہ انداز میں فرمایا۔

میں عجیب مشکل میں مبتلا تھا کہ کر کیا رہے تھے، ہونے کیا لگا۔ وزارتِ قانون کا کمرہ کوہِ طور بن چکا تھا، اور اندیشہ تھا کہ مجوزہ قانون کہیں تورات کا درجہ حاصل نہ کر جائے۔ زیادہ فکر اس کا تھا کہ اسرائیل ناقابل قبول ملک ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت پاکستان برغاست بھی کر دے اور جلاوطن بھی۔ بہر حال، لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، مکمل طور پر پڑھ کر کام کی طرف متوجہ ہوا، مگر مسعود الحسن صاحب کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔

"لاہور گئے ہیں آپ کبھی ؟"

"جی لاہور ——— لاہور تو میں کچھ عرصہ تعینات بھی رہا ہوں۔"

"بحیثیت ؟"

"بحیثیت رجسٹرار، انکم ٹیکس اپالیٹ ٹرائبیونل، اپرمال، لاہور۔"

"تو مزاراتِ لاہور کی زیارت تو خوب رہی ہوگی۔"

"جی مزارات کی زیارت ! جی ہاں، جی ہاں، کیوں نہیں۔ داتا کے دربار پر حاضر ہوا ہوں، حسبِ توفیق۔"

"ایک داتا کا دربار ہی تو نہیں لاہور میں۔ آپ نے میری کتاب "اولیائے لاہور" نہیں پڑھی شاید۔ پڑھیں تو پیش کروں۔"

"ضرور ضرور، لیکن پہلے اِس ڈرافٹ کی لکھائی پڑھائی تو مکمل ہو جائے۔"

"وہ تو ہو جائے گی، آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

اور واقعی وہ ہوگئی! ڈرافٹ تیار ہوکر کابینہ گیا، اور منظور ہوگیا، لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ لفظ "چوکیدار" کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کیا جائے۔ وزیرِ قانون تھے محمد ابراہیم خاں صاحب، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، انتہائی منصف مزاج، رحم دل اور شفیق بزرگ تھے۔ بہت ہی محبت سے پیش آتے تھے۔ مجھے بلا بھیجا اور فرمایا کہ بنگال میں "چوکیدار" کا لفظ اتنا معیوب ہے کہ چوکیدار کی لڑکی سے چوکیدار کا لڑکا بھی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ کوئی معزز گھرانہ اُس کو اپنے ہاں جگہ دینے پر آمادہ ہو۔ اِس لفظ کو تم بدل دو۔ ڈرافٹ تمہارا بہت پسند کیا گیا۔

"کیا لفظ آپ تجویز فرمائیں گے ؟"

"یہ تو میں تم پر چھوڑتا ہوں، لفظ ایسا ہو کہ چوکیداری کے فرائض بھی اس سے ظاہر ہوں، اور چوکیدار کی لڑکی کی شادی بھی آسانی سے ہو جائے !"

لفظ "چوکیدار" کم از کم سَو سال سے رائج تھا، لیکن آج تک کسی کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ ایک لفظ کیا کیا ستم ڈھا سکتا ہے۔ وزیرِ قانون نے جہاں یہ دُکھتی رگ پکڑی، وہاں یہ کام بھی بجا طور پر میرے سپرد کیا کہ اس لفظ کا متبادل بہتر لفظ تلاش کروں۔ دراصل وہ اُن وزرائے قانون میں سے تھے جو ڈرافٹنگ کی اہمیت کو سمجھتے تھے، اور ڈرافٹسمین کی قدر کرتے تھے۔

بنگال چوکیداری ایکٹ مجریہ ۱۸۵۶ء، اس کے بعد ویلیج چوکیداری ایکٹ مجریہ ۱۸۷۰ء، اور اس کے بعد بنگال ویلیج چوکیداری ایکٹ مجریہ ۱۸۷۱ء، وغیرہ وغیرہ، کی رُو سے گاؤں میں پولیس کے سربراہ کا نام چوکیدار تھا، اور گو بنیادی جمہوریتوں کے آرڈر کے تحت چوکیدار کے فرائض اور اختیارات میں معتدبہ اضافہ کیا جا رہا تھا، اس کا نام مسعود الحسن صاحب نے وہی چوکیدار رہنے دیا، اور میں چونکہ ان سے خائف رہنے لگا تھا، اِس لئے گاؤں تو کیا، تحصیل اور تھانوں کے متعلق بھی ان سے کچھ زیادہ سوال جواب نہیں کر سکا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کام میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ لفظ "چوکیدار" کوئی معیوب لفظ ہے۔

مسعود الحسن صاحب مراجعت فرمائے لاہور ہو چکے تھے اور میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اِس سلسلہ میں اُن کو واپس طلب کروں۔ اپنے رفقائے کار سے مشورہ کیا، کئی ڈکشنریاں دیکھیں، لغت ٹٹولے، مگر دال گلتی نظر نہ آئی۔ اتفاقاً، عصر کی نماز کے بعد، مسجد سے لوٹتے ہوتے ایک بزرگ اپنے عہدِ شباب میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی گرفتاری کا ذکر کرنے لگے، جو بفضلہٖ تعالیٰ ان کے ہاتھوں دیوبند اور مظفر نگر کے درمیان چلتی گاڑی رکوا کر عمل میں لائی گئی تھی۔ فرمانے لگے کہ جب میں کوتوال تھا۔ . . . . .

"آپ کا تعلق پولیس سے رہا ہے؟" میں نے ذرا خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔

"جی ہاں، میں تو ڈی، ایس، پی (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) کے عہدے سے ریٹائر

ہوا ہوں۔"

"ڈی، ایس، پی بڑا ہوتا ہے یا کوتوال؟"

"بڑے شہروں میں کوتوال کا مرتبہ ڈی، ایس، پی کے برابر ہوتا ہے۔"

"تو آپ کافی عرصہ کوتوال رہے —— مولانا حسین احمد مدنی کی گرفتاری سے لگا کر پاکستان میں ریٹائر ہونے تک!"

"جی نہیں، احتراماً سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کو بھی کوتوال کہہ دیا جاتا ہے۔"

اگلے روز وزیر قانون کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے تجویز پیش کی کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو "ویلج چوکیدار" کی جگہ "ویلج کوتوال" کی اصطلاح استعمال کر دی جائے۔

اُچھل پڑے۔ فرمانے لگے، کمال کر دیا تم نے، اب کسی چوکیدار کو اپنی لڑکی کی طرف سے کوئی تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔

چنانچہ ملاحظہ ہو —— بنیادی جمہوریتوں کا آرڈر مجریہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء —— ضمیمہ ۳ —— حصہ دوم۔

یہ ایک ایسی یادگار ہے جو شاید مرنے کے بعد بھی مجھے خوشیاں بہم پہنچاتی رہے!

عورت کی زندگی پر ایک نظر

(۱۹۴۷ء میں الہ آباد میں لکھا گیا، اُس وقت "فیملی پلاننگ" تو کیا، اِس اصطلاح سے بھی عوام ناواقف تھے، عائلی قانون تو کل نافذ ہوا ہے!)

فروری ۱۹۴۶ء کے "عصمت" میں ایک مضمون بعنوان "عورت کی زندگی پر ایک نظر" شائع ہوا تھا جس کا جواب دسمبر نمبر میں عصمت النسأ صاحبہ نے اسی عنوان کے تحت دیا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ عصمت النسأ صاحبہ کے خیالات کی پاکیزگی اور اصلاحی جوش قابلِ قدر ہے، لیکن موصوفہ اگر معاف کریں تو میں کہوں گی کہ حقائق سے بالکل آنکھیں بند کرکے محض تصورات کی خوشگوار اور دل پسند فضا میں پرواز کرنا تھوڑی دیر کے لئے تسکین کا باعث تو ہو سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس طرح ہم عورتوں کے لئے کوئی ٹھوس نتیجہ یا عمل کا صحیح راستہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

موصوفہ نے ایک سے زیادہ جگہ چار نکاح کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ رجحان ظاہر کرکے اس کے فوائد گنائے ہیں، اور موجودہ زمانہ میں اس رواج کی کمیابی پر عورتوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اِس طرح اُنہوں نے نہ صرف عورت کی، بلکہ انسان کی خوددار اور بلند فطرت پر بے جا چوٹ کی ہے، اور شادی کو جو دو قالب و یکجان کے مابین ایک معاہدہ

ہے، بار بار صرف مرد کی کمائی سے متعلق اور محدود کر کے اس معاہدہ کی توہین کی ہے، معاشی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی غلط استدلال کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سے زیادہ شادی کا رواج ہوتا تو آج اُن کی تعداد موجودہ تعداد سے چوگنی ہوتی، اور سیاست کی ترازو میں اُن کا پلّہ برادرانِ وطن سے کہیں بھاری ہوتا۔ غالباً یہ لکھتے وقت وہ ہندی کی یہ ضرب المثل بھول گئیں:

"آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی پتھر۔"

جس وقت تک مسلمانوں کو ملک میں عروج اور تموّل حاصل رہا وہ چار کیا، لونڈی اور باندیوں کے بہانے چار سے بھی زیادہ شادیاں کرتے رہے، مگر آج جبکہ ملک میں زیادہ تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو بوجہ افلاس ایک بیوی اور چند بچّوں کی پرورش بھی معقول طریقہ پر نہیں کر سکتے، اُن کو چار نکاح کا مشورہ دینا یقیناً خودکشی پر آمادہ کرنے کے مترادف ہے۔ جہاں چار بچے بیماری، دُکھ اور اخلاقی گندگیوں سے نہ بچائے جاسکیں، اور صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ نہ کئے جاسکیں، غور کا مقام ہے کہ وہاں سولہ بچے کس طرح بھگتے جائیں گے، اور کیا وہ اس قابل ہوں گے کہ مقابل کے سولہ تو درکنار، چار پر بھی بھاری ہوسکیں۔ انگریز قوم جو آج ربع مسکون پر چھائی ہوئی ہے کیا اپنی تمام محکوم قوموں سے تعداد میں زیادہ ہے؟ اور جاپان جس نے تقریباً نصف دنیا کو تلپٹ کر ڈالا تھا، کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک نہایت چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ عربوں ہی کی مثال لے لیجئے، اُن کو تعداد نے نہیں، اسلام نے دنیا پر حاوی کر دیا تھا۔ دس کروڑ تو بہت ہوتے ہیں، اگر ہندوستان کے مسلمان صحیح انسان ہوں تو اس سے نصف بھی ہندوستان تو کیا، ساری دُنیا پر غالب آسکتے ہیں۔

آگے چل کر موصوفہ اقتصادی پہلو سے اپنے نظریہ کی تائید اس طرح کرتی ہیں، کہ تعددِ ازدواج کی صورت میں ملازمین کے اخراجات پس انداز کئے جاسکتے ہیں۔ ملازمین پر واقعی بہت کافی خرچ آتا ہے، مگر نہ اتنا جیسا کہ ان کا خیال ہے، کہ اس سے مزید تین بیویاں اور اُن کے درجن بھر بچے پل جائیں۔ یہ درست سہی کہ اکثر حالات میں گھر کا کام اور انتظام ایک عورت کی طاقت سے زیادہ ہوتا ہے، مگر اس کا علاج اس طرح کرنا کہ عورتوں کی تعداد

بڑھالی جائے، کہاں کی عقلمندی ہے۔ اگر گھر میں بجائے ایک کے چار آدمی ہوں گے، تو کیا کام بھی اسی مقدار سے پھیلا ہوا نہ ہوگا۔ حیثیت کے مطابق ملازمین بھی گھر کے دیگر ضروری اخراجات کی طرح لازمی ہیں۔ کفایت شعاری اور جزرسی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایسے اخراجات کو روک کر ملک کی آبادی میں اضافہ پر اضافہ کیا جائے، جبکہ حالت یہ ہے کہ افلاس کی زیادتی نے ضبطِ تولید جیسے ناگوار اور غیر مشرقی مسئلہ کو زیرِ غور لانے پر مجبور کر دیا ہے۔

اِسی خرچ اور آمدنی کے سلسلہ میں موصوفہ نے لگے ہاتھوں سینما کے شوق پر بھی لے دے کی ہے۔ بلاشبہ سینما کی روز بروز بڑھتی ہوئی وبا فوری توجہ کے لائق ہے، مگر اس کا وہ طریقہ درست نہیں جو آجکل ہماری اکثر مضمون نگار بہنوں نے اختیار کر رکھا ہے، کہ ہمیشہ صرف عورتوں کو موردِ الزام ٹھہرا کر ہدفِ طعن وتشنیع بنایا جائے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ آجکل کے اکثر زنانے اخبار ورسائل کے مطالعہ کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ملک کی کوئی عورت بغیر سینما دیکھے کھانا ہضم نہیں کر سکتی۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ پسماندہ طبقہ کا تو ذکر ہی کیا لاکھوں بڑے بڑے گھرانوں کی بیبیاں ایسی نکلیں گی جنہوں نے کبھی سینما کی شکل تک نہیں دیکھی! اور دوسری طرف یہ حالت ہے کہ ایک چھ آنے کا مزدور چار آنے سینما کے لئے بچا کر صرف دو آنے گھر میں دیتا ہے۔ کیا فریقِ ثانی کی فضول خرچیاں آمدنی پر اثر انداز نہیں ہوتیں؟

موصوفہ کا یہ خیال ایک حد تک درست ہے کہ گناہ کا زیادہ تر بوجھ عورت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی بڑی وجہ قدرت نہیں بلکہ سوسائٹی کے موجودہ قوانین ہیں، مگر موصوفہ کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ گناہ مَرد کی جسمانی رعنائی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ بُرے افعال ہر حالت میں جسمانی صحت کے بھی اتنے ہی رہزن ہیں جتنے روحانی پاکیزگی کے، مگر عورت چونکہ قدرتاً جسمانی لحاظ سے کچھ کمزور واقع ہوئی ہے، مرد کی شان ہی صحت اور طاقت سے سمجھی جاتی ہے اِس لئے کہنے کی ضرورت نہیں، کہ گناہ کا سلوک اُس کی ذات سے کتنا بے رحمانہ ہوتا ہے۔

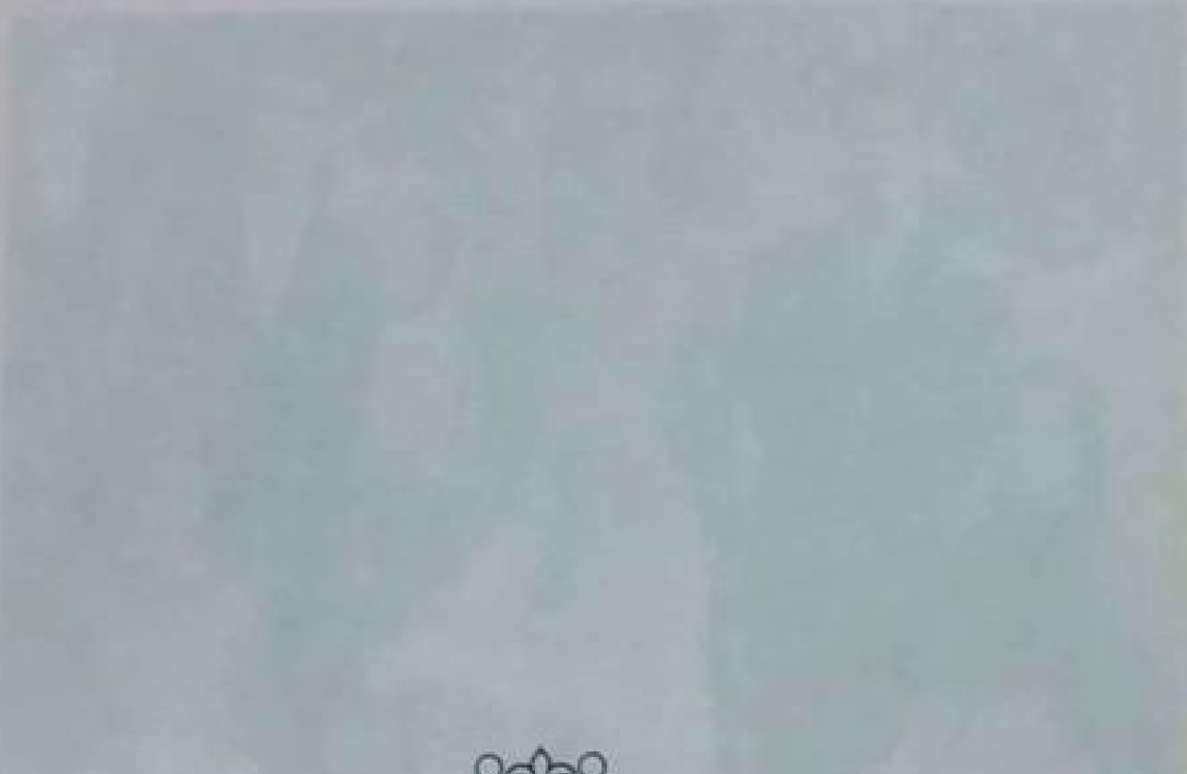
آخر میں موصوفہ نے نہایت جوشیلے انداز میں عورتوں کو خود غرضی اور نفس پرستی

پر ملامت کرتے ہوئے چار شادیوں کو سوسائٹی کی ہر خرابی کا واحد علاج بتایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت میں کسی کی شرکت کو گوارا نہ کرنے کو فلسفۂ اخلاق کے کونسے اصول کے مطابق نفس پرستی یا خود غرضی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتی ہیں کہ عورت میں حیا اور احتیاط قدرت نے بہت زیادہ رکھی ہے۔ شاید اُن کو معلوم نہیں کہ حیا اور احتیاط سے بھی کہیں زیادہ عورت کے اندر غیرت کا خمیر ہے اور غیرت وہ چیز ہے جو محبت کی توہین پر دولت کیا، جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔ اور شادی، برخلاف موصوفہ کی رائے کے جنہوں نے اِس رشتہ کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر نہایت عامیانہ معنی لے کر اس کو صرف روپے پیسے پر محدود کر دیا ہے، شادی کے وقت نہ سہی، بعد میں قطعاً محبت کے بندھن کا دوسرا نام ہے۔

پھر تعدد ازدواج کی یہ قصیدہ خوانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ موصوفہ نے نہایت ستم ظریفی سے کام لیتے ہوئے گھر کی رونق، دماغی سکون اور قلبی مسرت کے اِس دشمنِ جاں کو عورتوں کی صحت اور تندرستی کا ضامن بھی قرار دیا ہے۔ آج کون ہے جو دو شادیوں کی تباہ کاری سے ناواقف ہو اور دو بیوی والے گھر کو دوزخ کا نمونہ کہنے سے انکار کر سکے، چہ جائیکہ تین تین چار چار شادیاں، جن سے بلاشبہ اچھا خاصہ گھر جہنم کا ساتواں طبقہ بن کر طرفین کی مسرت، سکون اور صحت کو جلا جلا کر خاک سیاہ کر سکتا ہے۔ اگر اس صورتِ حال یعنی لڑائی جھگڑے، رقابت اور خصومت پر موصوفہ عورتوں کو ملزم ٹھہراتی ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فطرت سے جنگ کرنا چاہتی ہیں۔

رہے کثرتِ اولاد وغیرہ کے مسائل، تو کیا ان سب کے حل کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ تمام ازدواجی تعلقات میں محبت، یگانگت اور سمجھوتے کی ایک خوشگوار فضا پیدا کر لی جائے۔ عورت ازدواجی زندگی کی خاطر سیکڑوں قربانیاں کرتی ہے۔ کیا فریقِ ثانی سے اتنی بھی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اپنی رفیقِ زندگی کی صحت کا تھوڑا بہت لحاظ کر لے، جس میں اس کی خانگی مسرتوں کا، بلکہ حقیقتاً خود اس کی صحت کا بھی، راز پوشیدہ ہے۔

موصوفہ نے اخلاقی خرابیوں کی روک تھام کے لئے بھی یہی چار شادیوں والا نسخہ تجویز کیا ہے، مگر انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے جان سکتے ہیں کہ ان خرابیوں کا علاج اگر چار کا عدد پچاس تک بھی بڑھا دیا جائے تو ممکن نہیں۔ ہوس کا دامن جتنا پھیلاؤ پھیلتا ہی جائے گا۔ ایسے نقائص شادیوں سے نہیں صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہی دُور کئے جا سکتے ہیں۔



مادرِ ملت کے ساتھ، فلیگ اسٹاف ہاؤس میں: ۱۹۶۴ء

چشتی بن
صُبح و مجُاھد

غازی بن
صُبح و مجاھد



ایشیا بنتِ
صُبح و مجاھد

(حوالہ: صفحہ ۶۰)

بہو یا بیٹی

(افسانہ جو "اخبارِ خواتین" کراچی
مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا)

"ہماری عزت تمہارے ہاتھ اور خاندان کی شان بڑھانا اب تمہارا کام ہے، بیٹی! ہر شریف لڑکی، شادی کے بعد، اپنی پرانی دنیا سے کٹ کر، نہ صرف ایک نئے ماحول اور نئی دنیا میں داخل ہوتی ہے بلکہ اس دنیا کے ہر کانٹے کو پھول، ہر سنگریزے کو لعل و گوہر اور ہر زحمت کو رحمت سمجھنا لڑکی کا اوّلین فرض ہے۔" پُرتحسین آوازوں اور داد بڑھانے والی نظروں سے ابّو پُرجوش ہو گئے تھے، اور ہچکیوں اور آنسوؤں کے باوجود فصیح و بلیغ الفاظ کا دریا اُن کے ہونٹوں سے اُبلا پڑ رہا تھا۔

پھر سازوں کی دُھنیں زیادہ غمگین ہو گئیں، آہیں گھٹی گھٹی چیخیں بن گئیں، اور آپا کی سُرخ اور سنہری کفن میں لپٹی ہوئی، زندہ لاش آہستہ آہستہ گھر سے دُور ہونے لگی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی: یہ آہیں، یہ سسکیاں، یہ آنسو، یہ چیخیں، یہ اُداسی اور یہ بھیانک سناٹا جس تقریب

کا انجام ہوں، اس کو شادی کا نام دینا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے ؟

وہ اور امی آپا کی سسرال میں مدعو تھیں۔ آپا کی ساس نے اپنی چند ملنے والیوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ ابھی دیگر مدعو خواتین تشریف نہیں لائی تھیں۔ اِس لئے ساس اور امی مصروفِ گفتگو تھیں۔ شادی کے بعد کے تمام تکلفات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب گھر کا سارا انتظام و انصرام آپا کے سپرد تھا! اور امی کی نصیحتیں امید سے بڑھ کر اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ ایسی صورت میں، ظاہر ہے ساس صاحبہ کو باتوں کے علاوہ کوئی مشغلہ نہ تھا۔ وہ آپا کو ہدایات دیتی جاتی تھیں، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی قصیدہ خوانی بھی کرتی جاتی تھیں۔

"بھئی بہو ہو تو ایسی، بے زبان، فرماں بردار، اور کام میں جیسے مشین۔ میں تو کہتی ہوں اگر سب مائیں تمہاری طرح تربیت دیں، بہن! تو چوبیس گھنٹے کا قصہ ٹنٹا ہی جاتا رہے۔"

امی تھیں، کہ کھلی جا رہی تھیں۔ سمدھن کے ہر ہر لفظ پر چلّوؤں خون بڑھ رہا تھا۔ اور فخر سے گردن تن گئی تھی۔

"اے دُلہن"! ساس پھر آپا کی طرف متوجہ ہوئیں، جو تقریباً دو گھنٹے تک ساس اور شوہر کی ہدایتوں پر عمل کرنے کے بعد اب ذرا کی ذرا سانس لینے اور حواس درست کرنے کے لئے نزدیک ہی چوکی پر ٹک گئی تھیں۔

"یہ ذرا چاندنی بھی بدلوا دیتیں، کچھ میلی سی محسوس ہوتی ہے۔" آپا فوراً ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح مصروف ہو گئیں اور دم کے دم میں نہ صرف چاندنی بلکہ گاؤ تکیوں کے غلاف اور گدیوں کے کور تک بدل ڈالے۔

کچھ ہی دیر بعد مہمان بیبیاں آنی شروع ہو گئیں۔ ان میں ایک بی بی خلافِ معمول بڑی پُروقار تھیں، مگر حسبِ دستور باتونی بھی۔ امی سے تعارف ہونے کی دیر تھی کہ بس شروع ہو گئیں۔ "ماشاء اللہ تربیت تو خوب دی ہے بچی کو، مجھے تو بڑا رشک آتا ہے اپنی ان بہن پر۔ خدا سب کو ایسی بہوئیں نصیب کرے۔ بہو کیا ہے ہیرا ہے ہیرا۔ اس زمانے میں اور ایسی لڑکی، بہن! ہم نے تو پہلے زمانے میں بھی نہ دیکھی تھیں۔"

"لو بھلا پہلے زمانے کو کیوں کہتی ہو؟" آپا کی ساس جیسے تڑپ کر بولیں۔ "کیا تم پہلے زمانے کی نہیں تھیں؟ رشک تو تمہاری ساس پر آتا تھا، دنیا کو۔" پھر امی کی طرف جھک کر بڑی رازداری سے بولیں۔ "ان کی بپتی سنو تو یقین نہ کرو۔" اور امی کو ہمہ تن شوق پا کر انھوں نے ان قابلِ رشک بی بی کی بپتی شروع کر دی۔ "کون سا عیب تھا جو ان کے شوہر میں نہ تھا۔ میں تو کہتی ہوں خدا دشمن کو بھی ایسا خاوند نہ دے۔ پھر ستم بالائے ستم مزاج کی سختی جب تک ساس زندہ رہیں، تھیں وہ بھی بڑی جابر، دونوں ہی کی خدمت کرتے وقت گزرتا بیچاری کا، مگر پھر بھی اُن کا دم غنیمت تھا کہ صاحبزادے زیادہ آزاد نہ ہو سکے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی کچھ نہ پوچھو، بہن، خدا جھوٹ نہ بلوائے، وہ کھل کھیلے کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر شاباش ہے اس نیک بخت کو کبھی نہ منہ سے اُف کی، نہ خدمت اور اطاعت میں کمی۔ اور جب ساری دولت اڑا، اور جائیداد پھونک، گھر بیٹھے تو میاں کے آرام و آسائش اور فرمانبرداری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ چپکے چپکے سلائی سے کڑھائی سے، گھر کے خرچ کے علاوہ، ان کے مطالبات بھی پورے کئے۔ سارے خاندان میں ان کی مثال دی جاتی ہے۔ اللہ ایسی بیٹیاں، ایسی بہوئیں سب کو نصیب کرے" امی نے نہایت عقیدت اور عزت سے بھرپور لہجہ میں، بلند آواز سے آمین کہی ساتھ ہی ان کی اچٹتی نظریں بڑی بی کی آنکھوں سے ٹکرائیں جن میں ماضی کے سارے درد اور دکھی یادیں آنسو بن کر اُمنڈ آئی تھیں۔

کروٹیں بدلتے بدلتے اُس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا، مگر نیند تھی کہ آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ آپا کے گھر میں آج دِن کی دعوت نے اس کے دماغ کو بُری طرح مصروف کر رکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اگر یہی لیل و نہار رہے تو بیچاری آپا کتنے دِن اور جی سکے گی۔ اوّل تو وہ ہمیشہ ہی کی دُبلی پتلی اور زرد رو تھیں، اور اب تو اُن میں جو دم تھا وہ بھی بڑی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اُسے بعض اوقات بڑا غصّہ آتا تھا کہ جو وہ دیکھتی اور سوچتی ہے، دوسرے کیوں نہیں سوچتے۔ بہنوئی بلا کے لاڈلے، بے حد ضدی اور سخت مزاج۔ ساس اگر سخت مزاج نہ تھیں تو انھوں نے، از راہِ کرم، گھر کی تمام ذمہ داری بہو کو سونپ کر یہ کمی بھی پوری کر دی تھی، اور غریب آپا پہ یہ مثل صادق آتی تھی۔ ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی۔

وہ جب بھی آپا کے گھر سے آتی اس کے دماغ کی یہی کیفیت ہوتی۔ آپا کے دُکھ کے علاوہ ایک اور بہت بڑا، بھیانک اور انجانا سا درد آسیب کی طرح، کئی کئی دن اُس پر چھایا رہتا جس کو نہ وہ کوئی نام دے سکتی تھی اور نہ اچھی طرح پہچان سکتی تھی۔ بس ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے خیالوں میں آکر آپا محض آپا نہ رہتی ہو بلکہ اپنی صنف کا جمِ غفیر بن جاتی ہو، اور اس کا یہ تھوڑا سا درد ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں آسمان سے چھوجاتا ہو۔ اور آج تو بڑی بی کے کردار نے درد کے اس لامحدود اور غلیظ ڈھیر میں بے گنتی سانپ اور بچھو پیدا کر دئے تھے جن کی کلبلاہٹ ڈراونی اور گھناؤنی تھی۔

اس نے گھبرا کر لیمپ روشن کر دیا اور قریب ہی تپائی پر پڑے رسالوں میں سے یونہی ایک رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ یہ عورتوں کا ایک اصلاحی رسالہ تھا۔ یکایک اس کی نظریں ایک پیراگراف پر اٹک کر رہ گئیں۔ لکھا تھا:

"آج کل تعلیم پاکر خواتین جس ڈھرے پر چل رہی ہیں اور ان میں جو تمرد اور سرکشی پیدا ہو رہی ہے اس سے تو ان کا جاہل رہنا کہیں بہتر تھا۔ ہماری بزرگ خواتین کو آجکل جاہل سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ خواتین ایسی گوہرِ نایاب تھیں جن کا مثیل اب ممکن نہیں۔ شرافت، سعادت، اطاعت اور خدمت ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی اور شوہر پرستی کا یہ عالم ہوتا کہ یہ وفا شعار بیبیاں مرتے مرجاتیں مگر ان کے قدم راہِ وفا سے نہ ہٹتے۔ حتیٰ کہ بدعنوان، بے راہ، بداخلاق اور ظالم و جابر شوہروں کے لئے بھی ان کے اس طرز میں ذرہ بھر فرق نہ آتا۔ وہ خود قربان ہو جاتیں مگر خاندان اور بزرگوں کی عزت پر آنچ نہ آنے دیتیں۔ بیشک اُن کے کارنامے صفحاتِ عالم پر سُنہری حروف میں درج ہونے کے قابل ہیں۔"

اس نے جھنجھلا کر رسالے کو اُچھال دیا۔ "الٰہی" اس کا دِل چیخا "یہ کیسا اندھیر ہے، یہ کیسا غضب ہے، کیا ہمارے لئے انسانیت اور اخلاق کی بنیادی قدریں بھی بدل جاتی ہیں؟ کیا ہمارے لئے یہ مسلّمہ اصول بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ بُرے کے ساتھ بھلائی کرنا بذاتِ خود ایک برائی ہے۔" اس نے جذبات کی تلخی سے گھبرا کر تکیوں میں منہ چھپا لیا۔

امی ایک گھنٹہ سے سر پیٹ رہی تھیں مگر بہنوئی صاحب کی وہی ایک ٹانگ تھی، آپ اپنے گھر لے جا کر آخر کیا ہوگا' جو یہاں نہیں ہو سکتا۔ آپ دونوں نے یہاں ایک ماہ کے قیام میں کیا کر لیا جو وہاں کریں گی؟ یہاں کونسی کمی ہے جو وہاں پوری کی جائے۔" برابر ایسے ہی الٹے سیدھے جواب تھے جو وہ امی کو دے رہے تھے جنھوں نے آپا کو اپنے گھر لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

آپا کی حالت' درحصل نازک تھی۔ جو اندیشے اسے شروع سے کھائے جاتے تھے آخرکار پورے ہو کر رہے۔ رفتہ رفتہ اب نوبت ناامیدی تک پہنچ گئی تھی۔ یاس کی انتہا پر آ کر انسان کچھ امیدیں گھڑ لیتا ہے۔ اسے اور امی کو بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ اگر اپنے گھر لے جا کر غذا اور دوا کے علاوہ مریض کو سکون بھی پہنچایا جائے تو ممکن ہے کوئی بہتر نتیجہ نکلے۔ساس تو ابتدا ہی میں یہ کہہ کر کہ میں نے تو دونوں کو اپنے کاموں کا مختار کر دیا ہے' بری الذمہ ہو چکی تھیں۔ کوئی اور راہ نہ پا کر اس نے آپا کو راضی کرنے کی کوشش کی، مگر یہ بات اتنی آسان نہ تھی۔ وہ یہ دیکھ کر جل ہی تو گئی کہ وہ شوہر پرست پہلے ہی جان فدا کرنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھی ہیں' اور شوہر کی بلا اجازت میکہ تو رہا ایک طرف' جنت میں بھی جانے کو تیار نہیں۔ مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری' اور آخرکار کسی نہ کسی طرح اس پختہ وعدے پر کہ ہم دو تین دن کے اندر بہنوئی کو راضی کر کے آپ کے پاس لے آئیں گے، آپا کو گھر لے آئی۔

بعد کے چند روز جس طرح گزرے وہ' اذیت کے لحاظ سے' یادگار دن تھے۔ کوئی تدبیر' کوئی حیلہ' کوئی عذر معذرت بہنوئی کو نرم نہ کر سکی۔ ظاہر ہے اس طرح چلے آنا ایسی توہین نہ تھی جسے وہ نظر انداز کرتے' نہ ایسی خطا تھی جو اتنی آسانی سے معاف ہو سکتی! ابو جو اب تک حقیقتِ حال سے بے خبر تھے،' آپا کے بے ہوشی میں بڑبڑانے سے باخبر ہو چکے تھے۔ وہ تو کہیئے، صدمے اور فکر سے بے حال تھے' ورنہ قیامت برپا ہو جاتی ——— آپا کی حالت سے گھبرا کر وہ آخری کوشش کے لئے ٹیلیفون کرنے بھاگی کہ امی کی دلدوز چیخوں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ کبھی جاننا نہیں چاہتی تھیں۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ خود

بے ہوشی سے فرش پر ایک طرف لڑھک گئی ـــــــ آپا ہمیشہ کے لئے دکھوں سے آزاد ہو چکی تھیں!

کیسی عجیب بات تھی اس کی شادی کے متعلق جو اندیشے ابّو اور امّی کو گھلائے دیتے تھے، وہی خدشے اس کے لئے اطمینان اور خوشی کا باعث تھے! اس تضاد پر بعض اوقات اس کو افسوس بھی ہوتا، مگر اس کا قصور بھی کیا تھا جب کہ وہ کتنی ہی بار ان کو سمجھا چکی تھی۔ اسی لئے اس نے جب ایک دن امّی کو ایک فوٹو اور اس سے منسلک ڈگریاں، سرٹیفکیٹ اور شجرۂ نسب وغیرہ ہاتھ میں لئے، اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ لرز کر رہ گئی۔ امّی نے بڑے جوکھم اس کے لئے بر ڈھونڈا تھا لیکن وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی "امّی میں پہلے ہی آپ سے کہہ چکی ہوں مجھ میں اس ذمہ داری کی اہلیت نہیں"۔

"اہلیت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوگی"! امّی نے اس کو روکتے ہوئے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے"! اس نے رکھائی سے امّی کا ہاتھ جھٹک کر جواب دیا۔ "اتنا کچھ دیکھنے کے بعد آپ مجھے بہکا نہ سکیں گی"۔ "سنو تو"! امّی تیز ہوگئیں۔

"معاف کیجئے میں آپا جیسا بلند کردار پیش نہ کر سکوں گی"! طنز کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"زیادہ عقل مند نہیں بنا کرتے تمہیں کوئی بھی مشکل نہیں آئے گی۔ وہ یہیں آکر رہیگا"! امّی مصلحتاً نرمی اختیار کئے ہوئے تھیں۔

"یہ الٹی گنگا کیسے بہے گی"! اس نے زہر خند کیا۔

"اطمینان سے بیٹھو تو بات کریں"! یہ کہہ کر امّی خود بھی تخت پر بیٹھ گئیں اور اس کو بھی بٹھا لیا اور پھر بولیں "تمہارے ابّو بوڑھے ہو رہے ہیں نا۔ اور اس کے سہارے کے لئے کوئی لڑکا نہیں ہے آخر زمینوں کا انتظام . . . . . ."

"اوہ سمجھی!" وہ امّی کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی، اس کی مسکراہٹ بڑی تلخ تھی "ٹھیک ہے امّی! واقعی زر میں بڑا زور ہے"! وہ یہ کہکر پھر ہنس پڑی۔

امی چڑھ گئیں! غصہ سے بولیں "ٹھیک سے جواب دو نا؟"

"بھلا اب انکار کی کہاں گنجائش ہے؟" اب اس کی ہنسی بڑی بے باک تھی دراصل اس کو امی اور ابو پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔

اس کو اندازہ تو کافی عرصے سے ہو رہا تھا کہ شوہر کے تیور رفتہ رفتہ بدل رہے ہیں اور لاوا اندر ہی اندر کھول رہا ہے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں کتنی ہی بار ہو چکی تھیں۔ اگرچہ حالات کو سدھارنے کی یہ تینوں ہی کوشش کرتے تھے، مگر جب مقابل میں نیت نیک نہ ہو تو ایسی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔

ایک دن نقطۂ عروج پر پہنچ کر یہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ شوہر صاحب ابو کے پاس سے اٹھ کر سیدھے اسی کے کمرے میں در آئے اور چلا کر بولے "آخر تم سب نے سمجھا کیا ہے۔ میں کوئی غلام تو نہیں، نوکر سمجھ رکھا ہے نوکر۔"

وہ اس قسم کی چیخ پکار کی عرصے سے عادی ہو چکی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسے میں ہمیشہ صلح صفائی بے اثر ہوتی ہے۔ پھر بھی بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا: "خیر باشد۔"

"خیر اس گھر میں کہاں؟ ہر وقت کے حکم احکام، میں ننھا بچہ تو نہیں۔"

"حکم وکم کیا؟ ابو تو اپنائیت سے زمینوں وغیرہ کی دیکھ بھال کو کہہ دیتے ہیں۔" باوجود روکنے کے یہ سیدھے سچے لفظ اس کے منہ سے نکل گئے۔

"میں کہہ چکا ہوں، مجھے خود اپنے فرائض کا احساس ہے مگر میں پابندی برداشت نہیں کر سکتا۔ دراصل کسی کے گھر پر پڑنا مجھے نہیں آتا۔ تمہیں کیا معلوم مجھے اپنے دوستوں کے سامنے جاتے ہوئے کیسی شرم آتی ہے۔" ہمیشہ کچھ نرمی، کچھ معذرت سے صلح ہو جاتی تھی مگر آج طوفان بے ڈھب تھا۔ کسی سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ!

آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر ابو نے جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے بڑے مشفقانہ لہجہ میں کہا "جاؤ خدا تم دونوں کا حافظ و ناصر ہو" لفظ دونوں پر وہ تڑپ کر ابو کے قدموں پر گر پڑی اور سسکتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا "میں کہیں نہیں جاؤں گی، ابو میں ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہوں گی۔" "نہیں بیٹی" ابو اس کو اٹھاتے ہوئے

دھیمے مگر مضبوط لہجہ میں بولے: "شادی کے بعد لڑکی کا تعلق والدین کی دنیا سے ایک طرح ختم ہو جاتا ہے۔ اب تمہاری دنیا صرف وہ ہے"۔ اُنہوں نے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔ ایکدم اس کی نظریں شوہر کی طرف اٹھیں، مگر فوراً ہی نہ صرف نظریں بلکہ اُس کا سر بھی جھک گیا۔

سُسرال میں قدم رکھتے ہی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی ایک کونے میں جو ذرا تاریک تھا جا کر بیٹھ گئی۔ کئی عورتوں کی اس کی طرف پشت تھی اور جن کی پشت نہیں تھی وہ بھی باتوں میں اِس درجہ منہمک تھیں کہ انہوں نے اس کو نہ دیکھا۔ جن چہ میگوئیوں سے بچنے کے لئے وہ یہاں آکر بیٹھی تھی ان کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا۔ ایک صاحبہ بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہی تھیں: "غیرت ہو تو ایسی ہو، سُسرال کے مال و دولت پر لات مار دی"۔

"ہاں بھئی داماد تو فقیر بھی سسرال کے ٹکڑوں پر پلنا گوارا نہیں کرتا"۔ دوسری صاحبہ نے گویا تصوّف کے اہم نکتہ کی وضاحت کی۔ "لڑکے کو معلوم ہے دولت بھلا کہاں جائیگی"۔ کسی تیسری نے بڑی حقارت سے رائے زنی کی۔ "بڈھے بڑھیا کے علاوہ اور کون بیٹھا ہے۔ سب اپنا ہی اپنا ہے"۔

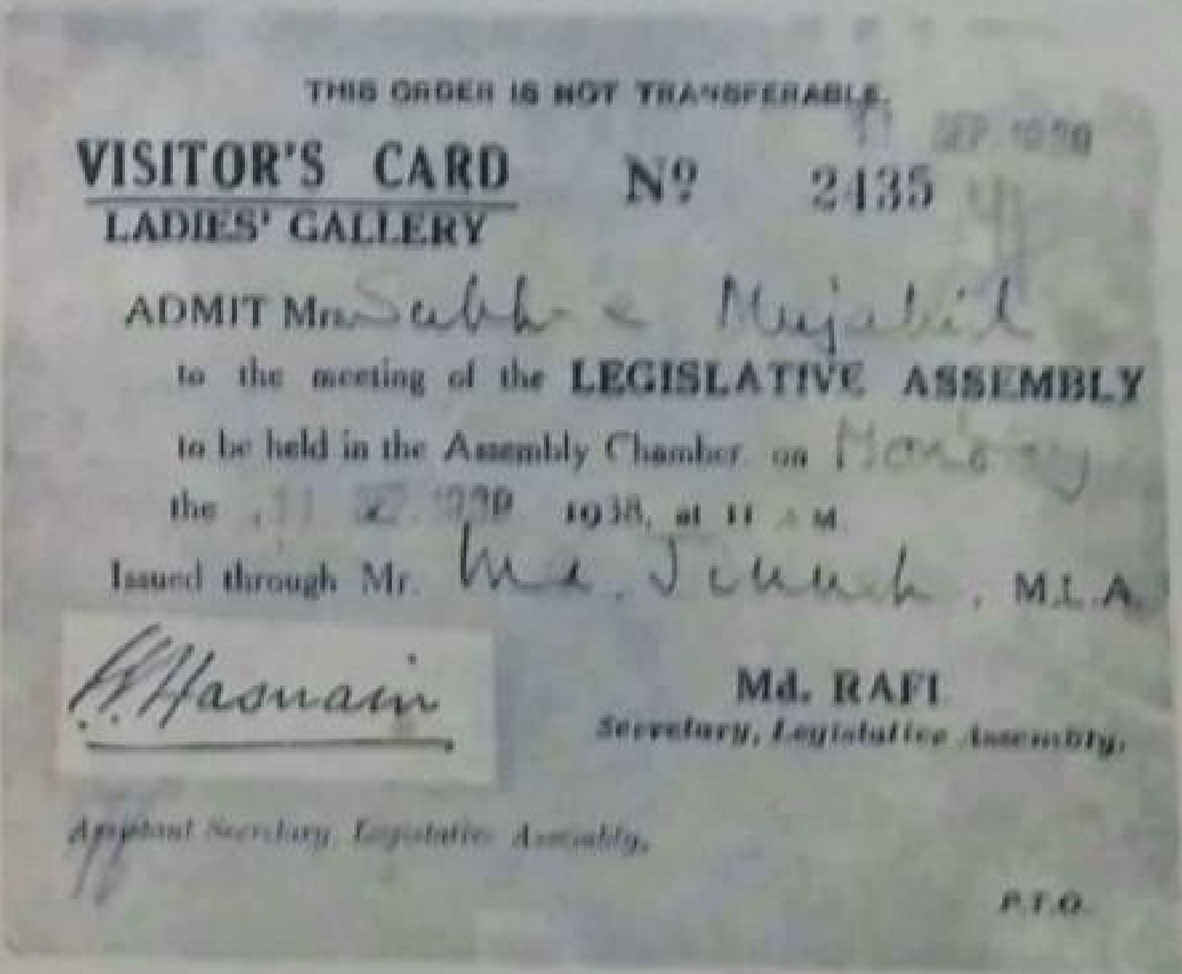
"اے تو کیا تم چاہتی ہو کہ وہ اپنی غیرت اور شرافت کی سزا میں اپنے جائز حق سے بھی محروم ہو جائے"۔ پہلی صاحبہ کے لہجہ میں وکیلانہ زور تھا۔ "کمال تو یہ ہے کہ بیوی بھی ساتھ ہی چلی آئی"۔ کوئی صاحبہ پیچھے سے بول پڑیں۔ "چلی کیسے نہ آتیں، بہن کے بھاگنے کا نتیجہ جو دیکھ چکی تھیں"۔ پہلی صاحبہ ذرا چمک کر بولیں۔ "کیا مرتی ہوئی بیٹی کا والدین کے گھر چلے آنا بھاگنا کہلائیگا"۔ درمیان سے نسبتاً جوان اور سنجیدہ سی آواز اُبھری۔ "بہلانے بھلے ہی چھانٹو، مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم شوہر کی بے اجازت خدا کے گھر جانے کو بھی بھاگنا ہی کہیں گے"۔ پہلی بیوی نے اِس شاعرانہ مبالغے پر مجمع سے کافی داد پائی۔ "مگر یہ بڑی کو ہوا کیا تھا۔ شروع میں تو بڑی دھوم تھی سسرال میں اطاعت اور خدمت کی۔ بعد کو نہ جانے کیوں بے چاری نے اپنی عاقبت خراب کی"۔

"یہ سب چھوٹی کی شرارت تھی"۔ پہلی صاحبہ نہ معلوم کیوں مخالفت پر تُلی ہوئی تھیں۔ "بات دراصل یہ ہے"۔ ایک صاحبہ نے جواب تک خاموش تھیں، بزعم خود بڑے وثوق سے تقریر شروع کی۔ "دونوں بہنوں

کی تربیت بڑی ہی خراب ہوئی تھی۔ مشرقی تہذیب تو ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اطاعت، خدمت، وفا اور حیا جو عورت کے خاص جوہر ہیں پاس نہ پھٹکے تھے۔ بڑی نے خود کو بہت بدل لیا تھا۔ اب ٹھوکر کھا کر چھوٹی بھی سیدھی ہو جائیں گی۔"

اس کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور اب زیادہ سُننے کے معنی یہ تھے کہ یا تو بولنے والیوں کے سر پھاڑ دیتی یا اپنا۔ فی الحال دونوں میں سے ایک کام بھی ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ اٹھی اور بے تحاشا سب پر سے کودتی پھاندتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسمبلی کا پاس جو قائد اعظم کی ضمانت پر جاری ہوا



THIS ORDER IS NOT TRANSFERABLE.

VISITOR'S CARD N° 2435

LADIES' GALLERY

ADMIT Mrs. Subh e Mujahid

to the meeting of the **LEGISLATIVE ASSEMBLY**

to be held in the Assembly Chamber on Monday

the [illegible] 1938, at 11 A.M.

Issued through Mr. M.A. Jinnah, M.L.A.

Hasnain

Assistant Secretary, Legislative Assembly.

Md. RAFI

Secretary, Legislative Assembly.

P.T.O.

(حوالہ، صفحہ ۳۴)

رازِ درونِ پردہ

(تیس سالہ سرکاری ملازمت کی آپ بیتی ——
"لبسے رنج بُردم دریں سال سی" —— کا ایک باب)

اِسی اثنا میں ایک نیا قاعدہ نکلا جس کی رُو سے تیسرے درجہ کے کلرکوں کی ترقی کے تمام دروازے بند ہو گئے، اور ان کے لئے محض ایک راستہ رہ گیا کہ شارٹ ہینڈ سیکھ کر اسٹینوگرافر بنیں، اور اِس فن میں اگر کمال حاصل کر سکیں تو اسمبلی میں رپورٹر ہو جائیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ملازمت ترک کر کے ایل ایل بی کی تعلیم جس کو ادھورا چھوڑ آیا تھا مکمل کر لوں اور وکالت کا پیشہ اختیار کر لوں۔ بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ شارٹ ہینڈ سیکھا جاتے۔

دہلی کی نئی سڑک پر ایک فونوٹائپ اسکول تھا۔ ۱۹۳۶ء میں وہاں داخلہ لیا۔ لیکن کام انتہائی غیر دلچسپ اور سخت محنت کا تھا۔ پہلے تو جی چاہا کہ چھوڑ دوں، مگر جدھر بھی نظر دوڑاتا، دُور دُور تک کوئی سہارا دکھائی نہ پڑتا۔ بیوی یہ کہہ کر اپنے بڑے بھائی ہارون احمد صاحب کے ہاں لکھنؤ چلی گئیں کہ جب شارٹ ہینڈ سیکھ لو تو مجھے جا کر لے آنا، اور مجھے اپنے دوسرے بھائی حافظ شمعون احمد صاحب کی تحویل

میں چھوڑ گئیں کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو۔ جو چیز پہاڑ نظر آتی تھی جوئے شیر ثابت ہوئی، اور اسکول کے پرنسپل مرزا محمد اسلام بیگ صاحب کا کہنا تھا کہ ان کی یاد میں چھ ہفتوں کے اندر اَسّی لفظ فی منٹ کی رفتار سے شارٹ ہینڈ لکھنا مجھ سے پہلے کسی نے نہیں سیکھا تھا۔ بہرحال، یہ مشکل بھی سر ہوئی۔ اور مجھے اب رفتار بڑھانے کا ایک شوق سا ہو گیا۔

شارٹ ہینڈ میں دو ہی چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں: ایک لکھنے کی رفتار، اور دوسرے لکھے کو پڑھ کر ٹائپ کرنا۔ اگر رفتار تیز ہو جاتی تو لکھا کوئی تقدیر کا تو نہ تھا کہ پڑھا بھی نہ جاتا۔ ٹائپ کا سرکاری امتحان میں ۱۹۳۴ء میں پاس کر ہی چکا تھا۔

نئی دہلی میں ایک ذرا اونچے پیمانے کا اسکول تھا۔ رفتاری مشقوں کے لئے وہاں داخلہ لیا، اور حوصلے اتنے بڑھتے گئے کہ رپورٹری کے خواب دکھائی دینے لگے۔ رپورٹر اس زمانہ میں گزٹیڈ افسر نہیں ہوا کرتے تھے، مگر رپورٹری اسٹینوگرافر کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ ساری اسمبلی میں لے دے کر ایک مسلمان رپورٹر تھے ——— محمد یوسف خاں۔ دوسرے نمبر پر اسٹینوگرافر کی معراج تھی کسی وزیر، یعنی وائسرائے کی کونسل کے ممبر کا پرسنل اسسٹنٹ ہونا۔ رائے صاحب بھگونت رائے جو ۱۹۳۵ء میں ہوم سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اب ہوم ممبر کے پرسنل اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ دونوں نے بہت ہمت افزائی کی ——— زبانی ہی نہیں، بلکہ عملی طور پر، کتابوں، کاپیوں اور پنسلوں کے عطیات دے دے کر۔ اگر اپنے کوٹے کی بچی ہوئی کاپی پنسلیں وہ نہ دیا کرتے تو مجھے ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا، اور شارٹ ہینڈ کی رفتار اس تیزی سے نہ بڑھتی۔ ان کی کاپیاں بہت قیمتی اور ایک خاص وضع کی ہوتی تھیں، جن پر لکھنے سے شارٹ ہینڈ کی رفتار کچھ خود بخود ہی بڑھ جاتی تھی۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں اسمبلی کے ایک اسٹینوگرافر اقبال محمد خاں صاحب نے میرے استاد محمد مختار احمد صاحب سے کہا کہ مسٹر جناح کو عارضی طور پر ایک آدمی کی ضرورت ہے، اور

اور وُہ اپنے کسی شاگرد کو نامزد کر دیں۔ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔ اقبال محمد خاں صاحب نے مجھے مسٹر جناح سے ملایا۔ پھر کچھ اُن کے طور طریقوں کے متعلق سمجھایا، اور کہا کل صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک ان کی خدمت میں رہا کرو، اور اس کے بعد حسبِ معمول اپنے دفتر چلے جایا کرو۔ اس زمانہ میں دفتر ساڑھے دس بجے کھل کر ساڑھے چار بجے بند ہو جایا کرتے تھے اور ایک سے دو تک ایک گھنٹہ لنچ کے لئے مقرر تھا ——— پانچ گھنٹے کام اور انیس گھنٹے مزا!

درحصل اقبال محمد خاں صاحب کا یہ مجھ پر ایک بہت بڑا احسان تھا جس کا صحیح احساس بعد میں ہوا۔ وہ نیشنل اسمبلی سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر جب ریٹائر ہوئے تو میں وزارتِ قانون میں ڈپٹی ڈرافٹسمین تھا، اور حکومتِ پاکستان کے اکثر افسر مجھ سے واقف تھے۔ اقبال محمد خاں صاحب نے کے ڈی اے میں ڈپٹی سیکرٹری کی آسامی کے لئے درخواست دی۔ اُس وقت ہاشمی صاحب، جو کبھی کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے، وزارتِ داخلہ سے بحیثیت ڈپٹی سیکرٹری ریٹائر ہو کر کے ڈی اے کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ اقبال محمد خاں صاحب کا کہنا تھا کہ اگر میں ایک سرٹیفکیٹ دیدوں تو ہاشمی صاحب نے تقرری کا وعدہ کر لیا ہے۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ میں ایک مدت سے اِس فکر میں تھا کہ اقبال محمد خاں صاحب کے احسان کا بدلہ اتارا جائے۔ فوراً سرٹیفکیٹ بھی دے دیا، اور ہاشمی صاحب سے زبانی بھی اقبال محمد خاں صاحب کی خوبیوں کی، اور خاص طور پر اُن کے بارِ احسان کا بھی ذکر کر دیا۔ اقبال محمد خاں صاحب کے ڈی اے میں ڈپٹی سیکرٹری ہو گئے، اور آخر دم تک وہیں رہے۔ اگر دیکھا جائے تو اب میں ہاشمی صاحب کا احسان مند ہوں۔ اُن کے احسان کا بدلہ کیسے اتارا جا سکتا ہے ——— نہ انہیں مجھ سے کام، نہ میں اب کسی قابل! احسان مندیوں کا سلسلہ بھی دنیا کے لامتناہی سلسلوں کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے!!

اقبال محمد خاں صاحب نے جو خدمت سپرد کی تھی، میں نے کم و بیش ڈھائی برس تک اس کو انتہائی فخر کے ساتھ انجام دیا۔ فخر کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ میں نے بحیثیت شارٹ ہینڈ رائیٹر سب سے پہلے اُس شخص سے ڈکٹیشن لیا جو بعد میں قائدِ اعظم کہلایا، اور جس نے دُنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۸ء میں بھی اُن کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر تھا، اور وہ سارے ہندوستان میں مہاتما گاندھی کے مدِّ مقابل سمجھے جاتے تھے۔ دوسرے عجیب اتفاق یہ ہوا کہ سب سے پہلا ڈکٹیشن جو قائدِ اعظم نے مجھے دیا وہ خط تھا ایک ایسے شخص کے نام جس کی شہرت دنیا بھر میں مہاتما گاندھی کی شہرت سے کچھ کم نہ تھی۔ کہنے لگے:

"لکھو، ڈیئر سر محمد اقبال"۔

میں شاید یہ دعویٰ بجا طور پر کر سکتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر سعادت غالباً اس سے پہلے کسی مسلمان اسٹینوگرافر کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی، اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسی سعادت کے طفیل بحیثیت اسٹینوگرافر میں نے امپیریل سیکرٹریٹ میں تین چار سال کے اندر اندر بفضلہٖ وہ درجہ پایا جس کے فراق میں اچھے اچھے اسٹینوگرافر پچیس پچیس، تیس تیس، برس تک گُھل گُھل کر ریٹائر ہو جایا کرتے تھے۔ ؎

اللہ کی دین ہے جسے دے
میراث نہیں بلند نامی! (اقبالؒ)

قائدِ اعظم اُس وقت گلِ رعنا میں مقیم تھے۔ یہ نئی دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کی کوٹھی تھی، جو بعد میں قائدِ ملت کہلائے۔ کام روزانہ پابندی سے ہوتا رہا ــــ ڈکٹیشن بیڈ روم میں دیا جاتا تھا، اور ٹائپ برآمدہ میں ہوتا تھا۔ ایک دن ڈکٹیشن کے بعد قائدِ اعظم نے فرمایا:

"آج تمہیں کام کرتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا، کیا اُجرت دی جائے؟"

"اُجرت! میں تو سرکاری ملازم ہوں، گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا ہوں"۔

"اِس کام کی تنخواہ بھی تم کو گورنمنٹ دیتی ہے؟"

"یہ کام تو عملی تربیت کے سلسلہ میں ہے' میں سرکاری ملازمت میں ترقی کے لئے شارٹ ہینڈ سیکھ رہا ہوں۔"

"نہ جانے کیا کہہ رہے ہو! یہ کوئی اسکول تو نہیں' اور تم نے کیا مجھے کنگال[1] سمجھا کہ مفت کام لوں!"

لہجہ ذرا درشت تھا' مگر وہ اُس وقت نہ گورنر جنرل تھے' اور نہ میں بے روزگار تھا۔ میں نے عرض کیا:

"یہ بات نہیں ہے' سرکاری ملازمت کے قواعد اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اُجرت پر کوئی اور کام کروں۔"

یہ کسی ملازمت کے قواعد نہیں ہو سکتے کہ فرصت کے اوقات میں کوئی کام کرو اور بھوکے مرو! کیا تنخواہ ہے تمہاری سرکاری ملازمت میں؟"

"چونسٹھ روپے مہینہ۔"

"چونسٹھ! سارے مہینے کے ——— کیا بکتے ہو!"

"جی' یہ بکواس نہیں' حقیقت ہے"۔

"عجیب بات ہے! مگر دیکھو' سالہا سال سے میں یہاں آتا ہوں' اور سرکاری ملازم ہی میرا یہ کام کرتے رہے ہیں جو تم کرتے ہو۔ جب مہینہ پر اُن کو سو روپے دیئے جاتے تو وہ کہتے کہ یہ آپ کیا دے رہے ہیں' ذرا زیادہ دیجئے۔ تم کیسے سرکاری ملازم ہو؛ جب میں کہتا ہوں کہ کیا دوں' تو کہتے ہو کہ کچھ نہیں۔ تم کچھ بے عملے[2] سے معلوم ہوتے ہو۔ اگر تم سو روپے لینے کے لئے تیار نہیں ہو تو کل سے مت آنا۔ میں کوئی کنگال تو نہیں' جو مفت کام لُوں!"

بادلِ ناخواستہ مجھے رخصت ہونا پڑا۔ جب اِس علیحدگی کا میں نے اپنی بیوی سے ذکر کیا تو کہنے لگیں کہ محنت کی کمائی تو حلال ہوتی ہے' لے لینے میں کیا حرج تھا' اور پھر مسلم لیگ

[2] Unpractical type of fellow [1] Pauper

کے صدر کو اس طرح ناراض کرنا اور ان کی خدمت کو دفعتاً ترک کر دینا ٹھیک نہیں۔ مگر میں نے یہ بات نہیں مانی، اور قائدِ اعظم کے پاس جانا چھوڑ دیا۔

تین چار دن بعد صنوبر خاں صاحب دفتر میں میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت لنچ کا وقفہ تھا، اور میں شارٹ ہینڈ کا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

"بھئی، آپ مسٹر جناح کو کیوں ناراض کر آئے؟"

"میں ناراض کر آیا! وہ تو آگ بگولہ ہو گئے، اور کہنے لگے کل سے مت آنا۔ اگر میں جاتا تو شاید مار بیٹھتے!"

"لاحول ولا قوۃ! کیا بات کرتے ہیں آپ۔ لو، یہ نوٹ لو، اور کل صبح سے پھر جانے لگو۔"

"سو روپے! میں ایک پیسہ بھی لینے کو تیار نہیں۔ صنوبر خاں صاحب، آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ کوئی سرکاری نوکر اُجرت پر کسی دوسرے کا کام نہیں کرتا۔"

"بالکل غلط آدمی ہیں آپ" —— صنوبر خاں صاحب نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"خیر، کل ذرا اپنی شکل تو دکھا آنا، اُن کو، بہت بے چین تھے بغیر تمہارے!"

صنوبر خاں صاحب اسمبلی کے بلند پایہ ریستوراں کے ٹھیکہ دار تھے، سیکرٹریٹ کے بھی کیٹرر تھے، نو وارد مسلمان ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے، گو پیسے ہمیشہ پورے لیتے تھے، مگر باتیں لچھے دار کرتے تھے۔ اسمبلی کے ممبر اور سیکرٹریٹ کے اعلیٰ افسر اُن کا خاص احترام کرتے تھے۔ پاکستان میں اُن کا کاروبار کچھ ایسا ہی رہا، اور ان کا شمار اُن شہیدوں میں کیا جاتا ہے جو لُٹ لُٹا کر پاکستان آئے اور یہاں پنپنے نہ پائے۔ غیرتمند اور باوضع بزرگ تھے۔ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔

اگلے روز صبح میں پھر قائدِ اعظم کے بیڈ روم میں جا پہنچا۔ بستر پر بیٹھے چائے پی

رہے تھے، کہنے لگے :

"ہیلو! تم آگئے، بہت اچھا ہوا، کئی خطوں کے جواب دینے ہیں، لکھو، لکھو۔"

میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ خط "الف" سے "یے" تک لکھاتے تھے، یہاں تک کہ آخر میں اپنا نام "ایم اے جناح" بھی بولا کرتے تھے۔ تلفظ صحیح اور لہجہ ٹھیٹھ انگریزی تھا۔ جس جس خط کا جواب لکھاتے میرے حوالے کرتے جاتے۔ بعض خطوط بہت تھرڈ کلاس ہوتے تھے، جن کو اگر میرا بس چلتا تو پھاڑ کر پھینک دیتا، مگر اسے قیادتِ عظمیٰ ہی کہیے، کہ وہ ہر خط کا جواب دیتے، اور بعض اوقات ایسا دیتے کہ میں اس کو ٹائپ کر کے بار بار پڑھتا، اور اس خط سے ملا کر دیکھتا جس کا وہ جواب ہوتا تھا، کہ کہیں غلط تو نہیں چھپ گیا۔ یہ بات میں نے آج تک کسی اور میں نہیں دیکھی۔ البتہ سر ایون جنکنس، جن کا آئندہ چل کر ۱۹۴۷ء میں پرنسپل اسسٹنٹ ہوا، اور جو اس وقت سپلائی سیکرٹری تھے، اور بعد میں پنجاب کے آخری گورنر ہوئے، خط و کتابت میں کبھی کبھی اس قسم کی بات پیدا کر دیا کرتے تھے۔

اُن دنوں مسلم لیگ کے چندے براہِ راست قائدِ اعظم کے پاس آتے تھے، اور وہ ہر چندہ کی رسید اپنے دستخط سے چندہ بھیجنے والے کو بھیجا کرتے تھے، خواہ چندہ ایک روپیہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مرتبہ میں نے اس دردسری کی وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے کہ مسلمان قوم چندہ جمع کرنے والوں سے بہت بدظن ہے، مسلمانوں کے اکثر لیڈر غالباً چندہ خور ہوئے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ یہ بدظنی آل انڈیا مسلم لیگ کے باب میں اب بھی روا رکھی جائے۔

دس بارہ روز اسی طرح گزرے ہوں گے کہ پھر اجرت کا سوال چھڑ گیا۔ اغلب صنوبر خاں صاحب نے نوٹ واپس کر دیا ہوگا۔ فرمانے لگے :

"تمہارا بلا اجرت کام کرنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کیوں نہ تم سرکاری نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ بمبئی چلو۔ شروع میں ڈیڑھ سو روپے مہینہ، اور پھر جیسا کام ویسے دام، ترقی کی کوئی حد نہیں۔"

پیشتر اس کے کہ میں اِس مسئلہ پر سوچنے کی مہلت مانگتا، وہ دوسری طرف دیکھنے لگے، لیکن فوراً ہی چونک کر بولے :

"دیکھو، کس قدر شرم کی بات ہے کہ بمبئی میں مسلمان اسٹینو گرافر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہوں، لیکن میرا اسٹینو گرافر عیسائی ہے۔ شارٹ ہینڈ کے لئے محنت درکار ہے اور مسلمان محنت سے دُور بھاگتا ہے۔ تم نے گریجویٹ ہو کر یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟"

"میرا ارادہ تو ایل ایل بی کر کے وکالت کرنے کا تھا، مگر حالات نے نوکری کرنے پر مجبور کر دیا، اور اب ترقی کا راستہ ایک یہی شارٹ ہینڈ رہ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دِن میں نوکری کروں، اور شام کو قانون پڑھوں۔ یہاں یہ نہیں ہو سکتا۔ بمبئی میں شاید اس کا انتظام ہو؟"

"مجھے معلوم نہیں، لیکن قانون میں کیا رکھا ہے، تم سمجھتے ہو وہ شارٹ ہینڈ سے بہتر چیز ہے۔ ہرگز نہیں سیکڑوں وکیل دھکے کھاتے پھرتے ہیں، لیکن اسٹینو گرافر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں آدمی بنا دوں گا۔"

میں نے جواب کے لئے مہلت مانگی، جو مل گئی۔ ایک ایسے شخص کا جواب جس کی شادی کی شرط سرکاری نوکری تھی، واضح تھا۔ پھر بھی میں نے مشورہ ضروری سمجھا۔ دیوانِ حافظ سے فال نکلی کہ نہیں۔ ؎

در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند
آدم بہشت روضۂ دار السلام را!

قائدِ اعظم اسمبلی کے اجلاس کے بعد جب بمبئی جانے لگے تو دو باتوں پر انہوں نے مجھ سے اظہارِ افسوس کیا: ایک تو میرے بلا اُجرت کام کرنے پر، دُوسرے اُن کے ساتھ بمبئی نہ جانے پر۔ لیکن یہ طے پایا کہ جب کبھی وہ دہلی اور شملہ آئیں گے، مجھے اُن کی خدمت کا موقع ملے گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں قائدِ اعظم ڈکٹیشن دیتے

دیتے کبھی کبھی مجھ سے صلاح مشورے بھی کرنے لگے' اور جب میں کچھ کہتا تو بعض اوقات اس طرح ہنستے جیسے بے وقوفی کی بات پر ہنسے ہوں' اور بعض اوقات میری طرف دیکھ کر مسکراتے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ میرے کام سے خوش تھے' اور میری باتوں سے ناخوش نہیں تھے۔

شملہ میں اُن کا قیام سیسل ہوٹل میں ہوتا تھا' اور دہلی میں انہوں نے سر ڈاہیا لکھا سنگھ صاحب سے ایک کوٹھی —— نمبر دس، اورنگ زیب روڈ —— ایک لاکھ روپے میں خرید لی تھی۔ اس کا معاہدہ انہوں نے خود مجھے لکھایا تھا' اور یہ پہلی قانونی دستاویز تھی جو میں نے لکھی۔ چند الفاظ میں میں نے ردو بدل کرنے کی اجازت چاہی، بعض کی منظوری مل گئی، بعض مسترد کر دیئے گئے۔

"تم کو قانونی الفاظ سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے' اس کی وجہ یہ تمہارا شارٹ ہینڈ ہے۔ قانون اور شارٹ ہینڈ کا بہت پرانا ساتھ ہے۔ مثلاً، میں بغیر شارٹ ہینڈ رائٹر کے دو قدم بھی آگے نہیں چل سکتا!"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک قہقہہ لگایا جس میں اپنی شرکت میں نے لامحالہ ضروری سمجھی!

ایک دن اسی کوٹھی میں قائدِ اعظم اور مَیں آمنے سامنے بیٹھے لکھا پڑھی کر رہے تھے کہ بَیرے نے آکر راجہ صاحب محمود آباد کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔ فرمایا، اچھا' سلام دو، اس وقت کسی ضروری کام سے آئے ہوں گے۔ راجہ صاحب اندر تشریف لائے، قائدِ اعظم کے قریب گئے اور کان میں کچھ کہا۔ قائدِ اعظم نے سر ہلایا' اور راجہ صاحب کورنش بجالاتے ہوئے پیچھے دروازے کی طرف چلے' اور چلتے چلتے دہلیز سے اٹک کر دھڑام چت! قائدِ اعظم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، لیکن اِدھر سے مَیں' اور اُدھر سے بَیرا لپکا کہ راجہ صاحب کو سہارا دیں۔ اِتنے میں راجہ صاحب اُٹھ چکے تھے' اور اس مرتبہ

بدستور کورنش بجالاتے رہنے کے علاوہ ہم سے معذرت خواہ بھی تھے۔ کیا آداب تھے' اُن بزرگوں کے' اور کس درجہ پاس تھا اُن کو قائدِ اعظم کا' اور اُن کے اسٹینوگرافر اور بیروں کا' — اب ویسی دہلیز نہیں تو میں' اور اگر ہوں بھی تو قائدِ اعظم کو راجہ صاحب محمود آباد کورنش کیونکر بجالائیں!

ایک اور دن کا ذکر ہے' باہر ایک کار آکر رُکی' قائدِ اعظم نے نظر اٹھائی' اور کہا:
"دیکھو' وہ تشریف لے آئے!"
مَیں نے مُڑکر دیکھا' خواجہ حسن نظامی صاحب کار سے اُتر رہے تھے۔
"جانتے ہو یہ کیوں آئے ہیں"؟
"جی نہیں"۔
"ایک اشتہار پر اُردو میں میرے دستخط چھاپیں گے' تاکہ اپنے مریدوں کو بتا سکیں' کہ میں اُردو زبان سے ناواقف نہیں ہوں' اور مسلمانوں کا صحیح لیڈر ہوں۔ بغیر اُردو کے تم مسلمانوں کے لیڈر نہیں بن سکتے!"
"مگر آپ اُردو میں دستخط کیسے کریں گے' میں کردوں گا آپ کی جگہ!"
"دیکھتے رہو تماشا' دستخط تو مجھی کو کرنے پڑیں گے"۔
خواجہ صاحب کی تشریف آوری کی اطلاع بیرا دے چکا تھا' قائدِ اعظم نے اُن کو بلا بھیجا۔ جب کمرے میں داخل ہوئے تو قائدِ اعظم نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا' اور کہا کہ لائیے' کہاں دستخط کروں۔ خواجہ صاحب کے پاس ایک کتابت شدہ اشتہار تھا۔ چند کاغذوں میں لپٹا ہوا۔ انہیں کھولا گیا۔ پہلے دو تین اور کاغذوں پر دستخط کرائے گئے' پنسل سے' اس کے بعد اشتہار کی باری آئی۔ ہر دستخط اِس طرح ہوتی تھی کہ پنسل قائدِ اعظم کے ہاتھ میں رہتی' اور قائدِ اعظم کا ہاتھ خواجہ صاحب کے ہاتھ میں رہتا۔ عجیب جناتی دستخط ہوئے' لیکن قائدِ اعظم اور خواجہ صاحب دونوں اِس کارکردگی پر بہت مطمئن نظر آتے تھے' جیسے کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہی تو سَر کرلی ہو!

"کیا خیال ہے تمہارا؟" قائدِ اعظم نے خواجہ صاحب کو کار میں بیٹھتے دیکھ کر مجھ سے دریافت کیا۔

"جو آپ کا خیال ہے وہی میرا بھی خیال ہے۔"

"کیا مطلب تمہارا؟"

"یعنی یہ کہ تماشا اچھا رہا۔"

قائدِ اعظم مسکرائے، مگر پھر ایک دم کچھ متاسف سے ہوئے، یا تو میری جسارت پر، یا اپنی قوم کے تماشوں پر!

اُنہی دِنوں فیڈرل کورٹ نیا نیا بنا تھا، اور سر شاہ سلیمان ایک جج کی حیثیت سے دہلی آگئے تھے۔ الٰہ آباد سے ایک اسٹینوگرافر اپنے ساتھ لائے تھے، مگر وہ واپس گھر جانا چاہتا تھا۔ یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے، اُس وقت اسٹینوگرافروں کی مانگ بہت کم تھی، اور مسلمان اسٹینوگرافر کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ اوّل تو اکثر افسر غیر مُسلم ہوتے تھے، پھر بھرتی کرنے والے اسسٹنٹ سیکرٹری وغیرہ اکثر ہندو ہوتے تھے، اور یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں میں اچھے اسٹینوگرافر ہوتے بھی نہیں تھے۔ مسلمانوں کے لئے جو مخصوص آسامیاں نکلتیں اُس پر سفارشی تعینات کر دئے جاتے۔

میرے ساتھ بھی ایک مرتبہ یہی حرکت ہوئی۔ ای ایچ اینڈ ایل ڈیپارٹمنٹ میں اسٹینوگرافر کی ایک جگہ کے لئے ٹیسٹ ہوا، بے شمار امیدوار تھے، جن میں کئی مدراسی بھی تھے۔ مدراسی شارٹ ہینڈ میں یدِطولیٰ کے لئے مشہور تھے۔ مسلمان کیا، سبھی اُن سے ڈرتے تھے، بلکہ وہ خود بھی ایک دوسرے سے ڈرتے تھے! میری رفتار اُس وقت دو سو بیس (۲۲۰) لفظ فی منٹ تھی۔ ٹیسٹ ایک سو بیس (۱۲۰) پر ہوا، اور میں اُس میں واقعی اوّل آگیا۔ بعد میں اعلان ہوا کہ جگہ مسلمان کے لئے مخصوص ہے، چنانچہ میری تقرری بالکل پکی ہوگئی۔ لیکن کچھ دِن بعد معلوم ہوا کہ کوئی اور صاحب اُس جگہ پر تعینات بھی کئے جا چکے ہیں، اور میری تقرری وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پتہ چلا کہ ان کی سفارش بھی

ایچ ایم، یعنی وزیر صاحب نے کی تھی، جو اُس وقت عارضی طور پر اس پورٹ فولیو کے انچارج تھے، اور بفضلہٖ مسلمان تھے!

میں نے بھی یہ نسخہ استعمال کرنا چاہا، اور قائدِ اعظم سے درخواست کی کہ وہ سر شاہ سلیمان سے میری سفارش کر دیں تو کام بن جائے۔ خلافِ توقع وہ بہت افروختہ ہوئے اور کہنے لگے :

"تم نے کیا سمجھا، میں کوئی ملازمت دلانے کی ایجنسی ہوں!"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، انہوں نے کچھ سوچا، اور ایک واقعہ کا ذکر کیا، جو حکومتِ ہند کے فنانس ممبر اور ان کے درمیان نوکریوں کے لئے مسلمان امیدوار نامزد کرنے کے سلسلہ میں کبھی پیش آیا تھا۔ فرمانے لگے :

"اسمبلی میں ایک بل زیرِ غور تھا، جس کے لئے حکومت کو میری پارٹی کی حمایت درکار تھی۔ سر بیسل بلیکٹ اُس وقت فنانس ممبر تھے، اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں چند آسامیاں خالی تھیں۔ معلوم خالی تھیں بھی یا نہیں۔ بہرحال فنانس ممبر نے مجھ سے کہا کہ مسٹر جناح، اِن آسامیوں کے لئے قابل مسلمان نہیں مل رہے ہیں، کچھ آپ ہی مدد کریں اور چند نام تجویز کر دیں۔ اگر مسٹر جناح کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تین آسامیوں کے لئے دس نام دیتا، لیکن تمہیں معلوم ہے میں نے کیا کہا۔ میں نے کہا کہ دیکھو، سر بیسل بلیکٹ، آسامیاں حکومت کی ہیں، تم بھی حکومت کے فنانس ممبر ہو۔ یہ تمہارا اور تمہاری حکومت کا کام ہے کہ اُن کے لئے اُمیدوار ڈھونڈے، مجھ سے اس کا کیا واسطہ۔ قابل مسلمانوں کی کمی نہیں ہے، بشرطیکہ تم اُن کو ملازمت دینا چاہو۔ حکومتِ ہند کا فنانس ممبر سمجھ گیا، کہ ہوا کا رُخ کدھر تھا!"

اِتنا کہہ کر اُنہوں نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا، اور شہادت کی انگلی کو نمایاں کر کے فرمایا :

"دیکھو، اگر میرے بیٹا ہوتا، تو اُس کے لئے بھی میں کوئی سفارش کبھی کسی سے نہ کرتا!"

اِس سانحہ کے بعد قائدِ اعظم کی خدمت میں کئی بار حاضری کا شرف حاصل ہوا،

یہاں تک کہ پاکستان میں بھی دو تین مرتبہ ملنا ہوا ——— اور خستہ حالی میں ملنا ہوا ———
لیکن وہ دِن ہے اور آج کا دِن، میں نے اُنھی سے کیا' اوروں سے بھی سفارش کے
لئے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ البتہ جب ضرورت ہوتی اپنی سفارش اپنے آپ ہی کر آتا۔ میں
نے دیکھا کہ انگریز براہِ راست سفارش کو زیادہ پسند کرتے تھے، اور ہیرا پھیری سے اتنے
متاثر نہیں ہوتے تھے۔ یہ بات پاکستانیوں میں ذرا کم ہے، یہاں اکثر ایک کی سفارش
دوسرا اُس وقت مانے گا جب اُس کی سفارش وہ ماننے کے قابل ہو' اور مانے۔ اور ہونا
بھی سودا نقد ہی چاہیئے: اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے!

جوں جوں وقت گزرتا گیا، قائدِ اعظم کا سلوک میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ غیر رسمی
ہوتا گیا۔ اور میں نے تقریباً ہر روز ہی ان سے ایک نہ ایک فیض حاصل کیا۔ لڑائی چھڑ جانے
کے بعد حکومت کے نئے نئے دفتر کھلنے لگے' اور اسٹینوگرافروں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔
مجھے بھی نومبر ۱۹۳۹ء میں سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں ایک جگہ مل گئی' اور تنخواہ ستّر روپے سے سَو سو
ہوگئی۔ کام بھی زیادہ ہوگیا' اور فرصت کے اوقات میں نمایاں کمی آنے لگی۔ اُس سال دہلی
میں قائدِ اعظم کی خدمت کا شرف حاصل رہا، مگر ایسا محسوس ہوا کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ
رہ سکے گا۔ خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی، ۱۹۴۰ء میں شملہ پہنچنے کے کچھ دِن بعد ترقی بھی ہوگئی اور
مجھے سپلائی سیکرٹری کا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کردیا گیا۔ تنخواہ میں پچاس روپے کی اسپشل پے
کا اضافہ ہوگیا' یعنی پونے دو سو روپے مہینہ!

اوّل تو سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ کا پیشہ ہی کچھ ضرورت سے زیادہ پرسنل ہوتا
ہے، پھر سیکرٹری بھی سر ایوان جنکنس جیسا مانا ہوا مجرد، بلا تکان صبح آٹھ سے رات کے آٹھ بجے
تک مسلسل کام کرنے والا۔ جو لڑائی شروع ہوتی تو نہ گھر کا ہوش رہتا نہ باہر کا۔ قائدِ اعظم اسمبلی
کے اجلاس کے سلسلہ میں سیسل ہوٹل میں مقیم تھے۔ یہ ہوٹل سمر ہل اور شملہ کے راستہ میں تھا۔
ہم سمر ہل میں رہتے تھے' اور دفاتر شملہ میں تھے۔ آتے جاتے بلاناغہ سیسل ہوٹل جاتا، اور
حتی الوسع قائدِ اعظم کی خدمت بھی کرتا۔ لیکن جب پانی سر سے گزرنے لگا تو میں نے اپنی

حالت زار کا ان سے ذکر کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ مجھے معلوم تھا کہ تم ترقی کر وگے۔ میرے لئے کوئی اور آدمی تلاش کر دو، اور تم اپنے کام کا حرج نہ ہونے دو۔ مجھے اُس وقت اپنی حالت پر سخت افسوس ہوا، کہ کیسے کیسے موقعے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ کہاں ہنکنسن اور کہاں جناح —— چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

میں نے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا، میرٹھ کے رہنے والے تھے، کالج میں مجھ سے ایک یا دو سال جونیئر تھے۔ پھر سیکرٹریٹ ہی میں آگئے تھے، غالباً معین نام تھا۔ وہ تیار ہو گئے، اور میرے ساتھ قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور صبح و شام کام کرنے لگے۔ پھر سرکاری ملازمت ترک کر کے اُن کے ساتھ بمبئی بھی چلے گئے، لیکن زیادہ عرصہ ہاں نہ رہ سکے، اور سید مطلوب حسین صاحب کو یہ عظیم الشان خدمت سپرد کر کے نہ معلوم کِدھر ہو لئے۔ پھر ان سے ملنا ہی نہیں ہوا۔ سید مطلوب حسین صاحب نے لگ کر اس خدمت کو انجام دیا —— یہاں تک کہ بمبئی ہی میں شادی بھی کر لی، اور ایم۔ ایچ۔ سید کے نام سے قائدِ اعظم کی ایک ضخیم سوانح عمری شائع کی۔ دہلی میں ایک مرتبہ اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے ہاں آئے تھے۔ صحیح معنی میں قائدِ اعظم کے سیکرٹری ہونے کے حقدار تھے۔ ان کے بعد خورشید حسن خورشید صاحب نے یہ عہدہ سنبھالا، جو کچھ عرصہ آزاد کشمیر کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور آجکل کراچی میں وکالت کرتے ہیں۔

جب میں قائدِ اعظم سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا، اور فرمایا:

"دیکھو، تم کئی سال سے میرا کام کرتے رہے ہو، مگر تم نے کبھی کوئی اُجرت منظور نہیں کی، میں چاہتا ہوں کہ تم کو کوئی تحفہ دوں، مس جناح بازار جاتی رہتی ہیں، ان کو بتادو، جو تم کہوگے وہ لادیں گی —— ایک گھڑی، کوئی فاؤنٹین پین، ایک سیوٹ لینگتھ؟"

وہ سوٹ کو سیوٹ کہتے تھے، اور یہی اس لفظ کا صحیح انگریزی تلفظ تھا۔

میں نے یہ پیش کش بھی نامنظور کر دی، اور قائدِ اعظم کو غصہ تو آیا ہوگا، مگر جانتے

تھے کہ آدمی ضدی ہے ـــــــ اور چونکہ خود طبیعت میں ضد تھی ـــــ اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ فرمایا:

"تمہیں تحفہ لینا ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی قیمتی ہو۔ بتاؤ، کیا لوگے؟"

"اگر آپ تحفہ دینے پر مُصر ہیں، تو ایک سرٹیفکیٹ دے دیجئے جو میرے پاس یادگار رہے گا۔"

"سرٹیفکیٹ! وہ تو میں نے آج تک کسی کو نہیں دیا۔"

"اگر آپ تحفہ دینے پر بضد ہیں، تو آپ کو سرٹیفکیٹ ہی دینا ہوگا۔"

"عجیب بات ہے، خیر، لکھو۔"

"آپ اپنے ہاتھ سے لکھیئے۔"

"کیا مشکل ہے، ایک تو سرٹیفکیٹ دوں، اور پھر خود اپنے ہاتھ سے لکھوں!"

"اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو میں سمجھوں گا کہ آپ تحفہ دینا نہیں چاہتے۔"

"کیا بک رہے ہو! اچھا کل صبح دفتر جاتے ہوئے اِدھر ہوتے جانا، رات کو شاید میں تمہارا سرٹیفکیٹ لکھ رکھوں۔"

اگلے روز میں نے ہوٹل کے کمرہ پر جا دستک دی۔

"اندر آجاؤ ــــ اوہ، تم ــــ وہ رکھا تمہارا سرٹیفکیٹ! قائدِاعظم نے لکھنے کی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے لپک کر سرٹیفکیٹ اُٹھا لیا۔

"پڑھو، ٹھیک ہے نا۔"

میں نے اس کو پڑھا، مگر مارے خوشی کے مجھے اُس کا ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دیا۔ جب میں اس کو جیب میں رکھنے لگا تو فرمایا:

"ٹھیک ہے نا، یا تم چاہتے ہو کہ میں اس میں کچھ اضافہ کروں۔"

"جی، بالکل ٹھیک ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ جس کا میں مستحق ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے۔ اچھا، خدا حافظ جب تک کہ پھر ملاقات ہو۔ اور ہاں، جب کبھی

تم مجھ سے ملنا ضروری سمجھو، بلا تامل چلے آنا۔"

وہ سرٹیفکیٹ آج بھی میرے لئے سرمایۂ حیات میں سے ہے۔

میں نے اِس کھلی اجازت سے کئی مرتبہ فائدہ اُٹھایا، اور انہوں نے ہمیشہ اپنا قول پُورا کیا، اور مجھے شرفِ باریابی بخشا۔ کم وبیش دس سال کے عرصہ میں ایک دفعہ نہ انہوں نے مجھ سے کبھی کسی سرکاری معاملہ کے متعلق دریافت کیا، نہ میں نے اُن سے کبھی اس قسم کا کوئی تذکرہ کیا۔ اگر کوئی اور ہوتا، تو سی آئی ڈی کا ایک اچھا خاصا سلسلہ قائم ہو جاتا۔

پیشتر اس کے کہ یہ باب ختم کیا جائے، دو باتوں کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا: ایک تو مسلمانوں پر عیسائیوں کی فوقیت کے متعلق، اور دوسری شارٹ ہینڈ کی عظمت کے متعلق۔

قائدِ اعظم نے ایک مرتبہ اِس بات پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ مسلمان اسٹینوگرافر نہیں ملتے، اور بمبئی میں اُن کا اسٹینوگرافر عیسائی ہے۔ چند سال بعد جب پوتھن جوزف صاحب اخبار "ڈان" کے پہلے ایڈیٹر مقرر کئے گئے، تو میں نے قائدِ اعظم کو وہ بات یاد دِلائی، اور اس عجیب اتفاق پر اظہارِ حیرت کیا۔

اُنہوں نے کہا کہ واقعی یہ عجیب اتفاق ہے، لیکن اب میرا اسٹینوگرافر بھی مسلمان ہے، اور تم دیکھو گے کہ کچھ عرصہ بعد "ڈان" کا ایڈیٹر بھی مسلمان ہی ہوگا۔ ساتھ ہی انہوں نے پوتھن جوزف صاحب کی قابلیت، اور اس سے بھی زیادہ مسلم لیگ سے اُن کی وفاداری کی بہت تعریف کی۔

شارٹ ہینڈ کے متعلق قائدِ اعظم کی رائے کا اندازہ اُس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو پاکستان بننے پر گورنمنٹ ہاؤس میں پیش آیا، جہاں وہ بحیثیت گورنر جنرل مقیم تھے۔ اُن کو بتایا گیا کہ منجملہ اور افسروں کے، گورنر جنرل کا ایک سیکرٹری بھی ہوتا ہے، اور

فلاں صاحب کو آپ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، ٹھیک ہے۔ جب سیکرٹری صاحب کو سلام دیا گیا، تو وہ اپنی سلپ بک ہاتھ میں لئے ہوئے حاضرِ خدمت ہو گئے۔ قائدِ اعظم نے دریافت کیا کہ تمہاری نوٹ بک کہاں ہے۔ انہوں نے سلپ بک دکھا کر کہا کہ یہ رہی۔ قائدِ اعظم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص سلپ بک پر ہی بغیر لائنوں کے شارٹ ہینڈ لکھ لیتا ہے۔ جب لکھانے لگے، تو سیکرٹری صاحب کچھ سٹ پٹائے، اور بجائے لکھنے کے عرض کرنے لگے کہ میں اس فنِ شریف سے ناواقف ہوں، میں تو سروس کا آدمی ہوں۔ انہوں نے کہا سروس سے تمہارا مقصد آئی سی ایس ہے۔ جواب ملا، جی ہاں۔ قائدِ اعظم نے حکم دیا کہ ابھی واپس چلے جاؤ، مجھے ایسا آئی سی ایس نہیں چاہیئے جو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ نہ جانتا ہو۔

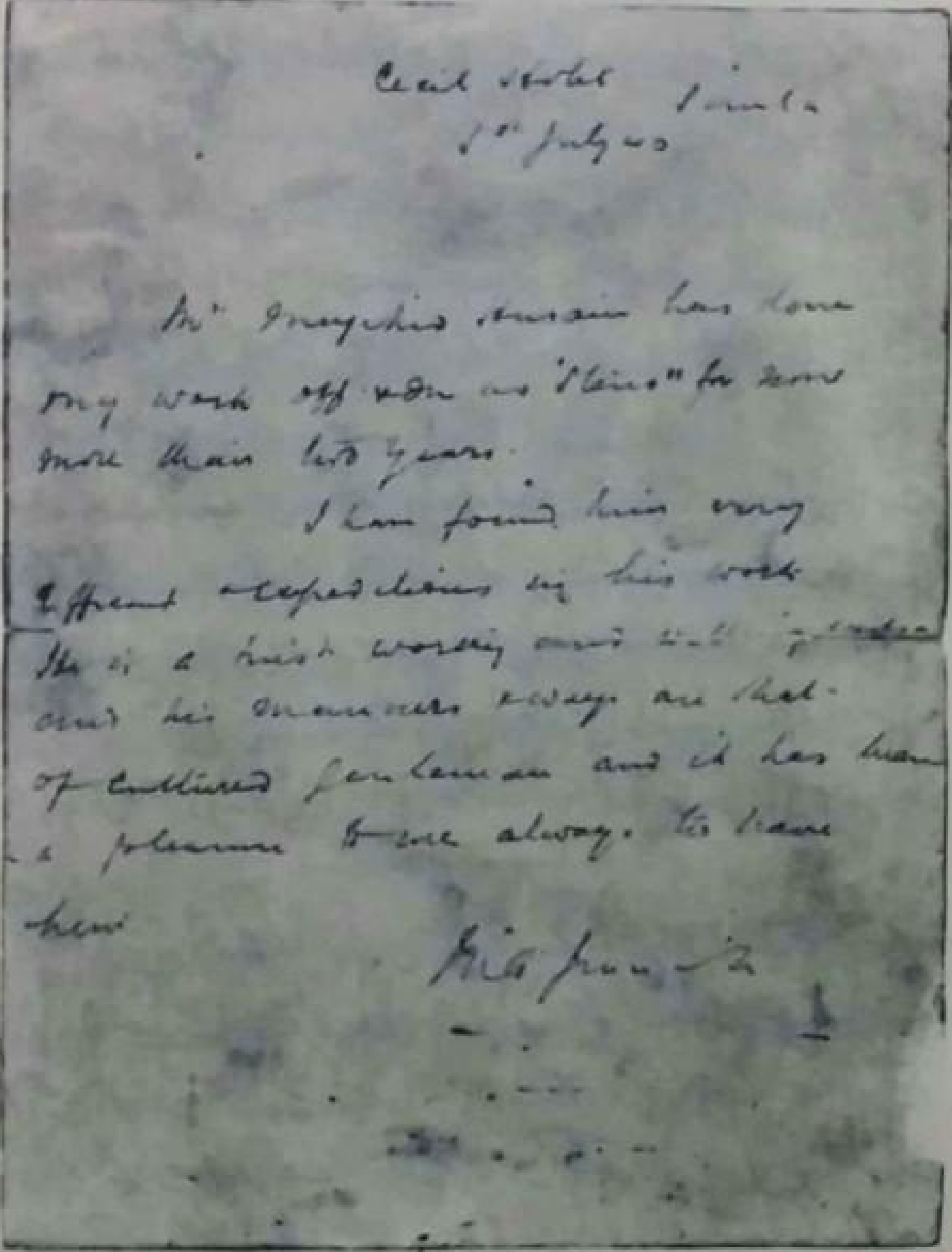
یہ بے چارے اس قدر سینئر افسر تھے کہ وہاں سے بیک بینی و دو گوش مراجعت فرما ہو کر ایک وزارت کے انچارج جائنٹ سیکرٹری بنے، اور کچھ عرصہ بعد پورے سیکرٹری بن گئے ——— یعنی اس مرتبہ حکومتِ پاکستان کی ایک وزارت کے!

یہ واقعہ خود انہوں نے مجھے سنایا، لیکن چونکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ نام کسی کو نہیں بتاؤں گا، اِس لئے اُن کا نام نہیں لکھ سکتا۔

آج قائدِ اعظم جیسے شارٹ ہینڈ کی قدر کرنے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے، اور شارٹ ہینڈ لکھنے والے بھی جارج برنارڈ شا کے پایہ کو کب پہنچ سکتے ہیں! یہ غلط ہے کہ اسٹینوگرافی ایک ذلیل پیشہ ہے۔ اِس کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں جن کو قائدِ اعظم کے اسٹینوگرافر ہونے کا شرف کبھی حاصل رہا ہو۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میں بہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کم مایہ لوگوں کے لئے اعلیٰ تربیت کا اِس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

(۷ ستمبر ۱۹۶۷ء)

قائداعظم کا سرٹیفیکیٹ جو تحفتاً دیا گیا



Cecil Hotel
Simla
8th July 40

Mr. [illegible] Husain has done my work off and on as "steno" for some more than two years.

I have found him very efficient and expeditious in his work. He is a hard working and intelligent and his manners & ways are that of cultured gentleman and it has been a pleasure to me always to have him.

M A Jinnah

(حوالہ : صفحہ ۵۳،۱۳۱)

دو ملاقاتیں

(دسمبر ۱۹۶۹ء میں لکھا گیا' اور "جنگ" اور "مشرق" کراچی کے قائدِاعظم ایڈیشن میں بیک وقت شائع ہوا)

پچھلے دنوں مسٹر فرخ امین کی موت نے دو ایسے واقعات کی یاد تازہ کر دی جنہیں قائدِاعظم کے قول و فعل میں تطابق کی زندہ جاوید مثالیں کہا جا سکتا ہے۔ فرخ امین ۱۹۴۷ء میں قائدِاعظم کے گورنر جنرل ہونے پر پاکستان میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ مجھے اس سے دس سال قبل' ۱۹۳۷ء میں' مسٹر محمد علی جناح نے اپنی خدمت کا موقع دیا تھا۔ ڈھائی تین سال بعد جب میں اُن سے رخصت ہوا تو فرمایا: "جب کبھی تم مجھ سے ملنا ضروری سمجھو' بلا تامل چلے آنا۔" یہ جولائی ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے۔ اس کھلی دعوت کے پیشِ نظر مجھے کبھی اُن سے ملنے میں دقت نہیں ہوئی' بجز دو مرتبہ کے' ایک اگست ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن میں' اور دوسرے دسمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں۔

۱۹۴۱ء میں میں چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ تھا' وہ حکومت ہند کے وزیرِ قانون تھے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں سر سید سلطان احمد صاحب کو اپنا عہدہ سونپ کر

فیڈرل کورٹ کے جج کی حیثیت سے حلف اٹھانے والے تھے۔ اِس سے پہلے مونسون ٹور، یعنی برکھا کے دَورہ پر روانہ ہوئے، شملہ سے دِلّی، کلکتہ اور ناگپور ہوتے ہوئے سکندرآباد پہنچے۔ اِس سفر میں ہمارے ساتھ منجملہ اور عملہ کے ایک نویں جماعت کا طالب علم بھی تھا، جو میرے کیبن میں رہا کرتا تھا۔ ہونہار لڑکا تھا، اور باتوں باتوں میں جب کبھی مسٹر جناح کا ذکر آتا، تو خاص دلچسپی سے سُنتا، اور طرح طرح کے سوالات کرتا۔ سر ظفراللہ کے عزیزوں میں تھا۔

سکندرآباد میں ہمارے میزبان ایک بہت بڑے سوداگر تھے، جو سر ظفراللہ کے خاص دوست تھے۔ صبح ناشتہ پر اُن کے ہاں مسٹر جناح اور سر سلطان کا ذکر چھڑا، کہ دونوں حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ کسی مقدمہ میں ایک دوسرے کے مدِمقابل کی حیثیت سے، لیکن ایک آدھ پیشی کے بعد مسٹر جناح بیمار پڑ گئے ہیں، اور ملنا جُلنا قطعی بند ہے۔ لڑکے نے میری طرف دیکھا، اور میں نے اپنے کھڑے کانوں سمیت سر ظفراللہ کی طرف۔ معاً اُس نے دریافت کیا:

"کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں مسٹر جناح ؟"

"اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں۔ کیوں، تم ان سے ملنا چاہتے ہو؟"

"جی، مُجاہد صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے کھلی دعوت ہے جب چاہوں مسٹر جناح کے پاس چلا جاؤں۔"

"مُجاہد تو مُجاہد، فرشتہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا!"

لڑکے نے پھر میری طرف دیکھا، اُس کی نظریں للچائی ہوئی تھیں، جیسے شوق کا کوئی سمندر اُس کے سینہ میں موجزن ہو۔ میں نے کہا:

"اگر ایک کار مرحمت فرمائی جائے تو میں اور یہ قسمت آزمائی کریں، شاید باریابی ہو۔"

"ایک کیا تم تین کاریں لے جا سکتے ہو، لیکن تم مسٹر جناح سے نہیں مل سکو گے، اور اگر مل لئے تو تمہارا اشمار اِس صدی کے عجوبۂ روزگار میں ہوگا!"

اُسی روز تیسرے پہر ایک بہت بڑی کار میں ہم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ مسٹر جناح کا پٹھان پاسبان اُن کے کمرہ کے باہر کھڑا تھا۔ یہ پٹھان میرے زمانہ کا پٹھان نہیں

تھا، اکڑنے لگا :

"صاحب بیمار ہے، کوئی ملاقاتی نہیں مانگتا۔"

"ہم تو شملہ سے ملنے آئے ہیں، بیماری کا حال سُن کر خیریت پوچھنے۔"

"شملہ لندن سب برابر، پوچھنے کا کوئی کام نہیں۔"

"اچھا، یہ کارڈ تو اندر لے جا کر دو۔"

"کارڈ لفافہ سب برابر، آپ زیادہ بات نہ کریں، صاحب ناراض ہوتا ہے۔"

اِتنے میں مسٹر جناح کی آواز آئی :

"بوائے !"

پٹھان بھاگا ہوا اندر گیا، واپس آکر کارڈ لے گیا، اور اُلٹے پاوں لوٹ کر کہنے لگا :

"صاحب سلام دیتا ہے۔"

یہ کہنا تھا اور میں اندر۔ واقعی مسٹر جناح صاحبِ فراش تھے، مس فاطمہ جناح پاس کرسی پر بیٹھی تھیں۔ دونوں دیکھ کر بہت خوش ہوئے :

"ارے، تم یہاں کہاں !"

"میں سر ظفراللہ کے ساتھ دَورہ پر کل یہاں آیا تھا، کل مدراس جائیں گے ہم لوگ، معلوم ہوا کہ آپ یہاں علیل ہیں، میں نے آج عیادت اپنا فرض سمجھا۔"

بہت اچھا کیا تم نے ——— سو، واٹس آل دی گپ !" (یہ اُن کا ایک خاص جملہ تھا)۔

"میرے ساتھ ایک لڑکا ہے، جو آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا، اس کو بھی لیتا آیا تھا۔"

"بوائے، باہر جو صاحب ہیں اُن کو سلام دو۔"

یہ کہنا تھا کہ لڑکا حاضر، مگر داخل ہوتے ہی کانپنے لگا۔

"یہ آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا" میں نے کہا۔

مسٹر جناح اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور مصافحہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اچھی طرح دیکھ لو۔

لڑکے کی آنکھوں میں آنسو تھے، اغلب خوشی کے، اور معلوم ہوتا تھا کہ زمین اس کے پاؤں تلے نکلی جا رہی ہے۔ مس جناح نے اس کو شربت کا گلاس لا کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم انتہائی فاتحانہ انداز میں کمرے سے باہر نکلے، پٹھان نے سیلیوٹ دیا، اور بہت دور تک ہم کو دیکھتا رہا کہ شاید یہ عجوبۂ روزگار پھر نہ دکھائی دے!

وہ لڑکا آج ایئر کموڈور ظفر چوہدری کے نام سے مشہور ہے، جس پر پاکستان کی فضائیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۴۷ء میں پیش آیا۔ میں لاہور میں انکم ٹیکس اپلیٹ ٹرائیبونل کا رجسٹرار تھا۔ الٰہ آباد سے بے سر و سامانی کی حالت میں آیا تھا، بیوی بچوں سمیت ماڈل ٹاؤن میں رہتا تھا۔ باپ بہاولپور میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے دو ہزار روپے دے کر مجھے دِلّی بھیجا کہ اپنے بہن بھائیوں کو وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لے آؤ۔ وہ لوگ دِلّی میں سخت پریشان تھے، جان کا خطرہ تھا۔ اُس وقت ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین تھے، جو میرے چچا زاد بھائی تھے۔ بیشتر اس کے کہ جہاز میں سیٹیں الاٹ کرتے یا کراتے، دِلّی سے لاہور کی سروس ہی بند ہو گئی، اور میں کراچی ہوتا ہوا لاہور ناکام واپس لوٹ آیا۔ عجیب کشمکش کا عالم تھا۔

غالباً دسمبر میں سُنا کہ قائدِ اعظم لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں۔ میں نے ملنے کی جسارت کی اور گورنمنٹ ہاؤس گیا۔ فرخ امین ملے، لیکن کہنے لگے کہ انٹرویو بالکل بند ہیں، کیونکہ قائدِ اعظم کو شدید قسم کا نزلہ، زکام اور بخار ہے۔ فرخ امین کسی زمانہ میں میرے ماتحت کام کر چکے تھے، لیکن احکام کے پیشِ نظر مجبور تھے۔ جائے اُستاد خالیست، میں نے بھی اگلے روز کسی نہ کسی طرح اپنا کارڈ مس جناح تک پہنچوا دیا۔ فوراً بلا بھیجا، قائدِ اعظم واقعی سخت بیمار تھے، بمشکل بات کر سکتے تھے۔ فرمانے لگے:

"کیا ہو گیا تم کو؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دے رہے ہو!"

"بے سر و سامانی ہے، مزید برآں بہن بھائیوں کی طرف سے باپ سخت پریشان

ہیں، اور ان کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔"

قائدِ اعظم اُن سے واقف تھے، کہنے لگے کہ اب تو بہت ضعیف ہو گئے ہونگے۔ لیکن قوموں کے بننے میں قربانیاں دینا پڑتی ہیں، ہر مشکل کا مقابلہ جوانمردی سے کرنا چاہیئے۔ پریشانیاں ہمیشہ نہیں رہا کرتیں۔

دو تین روز بعد، دفتر میں فرخ امین کا ٹیلیفون آیا کہ آج شام چار بجے ایک ہوائی جہاز لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام قائدِ اعظم کا ایک مراسلہ لے کر دِلّی جا رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ تم اُس جہاز سے دلی چلے جاؤ اور واپسی پر اپنے بہن بھائیوں کو اُس میں لے آؤ، جہاز کے کپتان کو ضروری ہدایات دے دی گئی ہیں۔

اگر میں اندھا ہوتا اور دو آنکھیں دی جاتیں، تو شاید اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی خوشی اس پیغام سے ہوئی۔

لیکن میں اُس جہاز سے دِلّی نہ جا سکا! ہوا یہ کہ ماڈل ٹاؤن سے جب والٹن کے اڈے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں سے کوئی جہاز دِلّی نہیں جا رہا۔ بحث مباحثہ کے بعد بتایا گیا کہ پاکستانی فضائیہ کے اڈے سے شاید جا رہا ہو، وہاں جا کر دیکھو۔ تانگہ جا چکا تھا، ٹیکسی کا لاہور میں نام و نشان بھی نہ تھا، دوسرا تانگہ کر کے فضائیہ کے اڈے پر پہنچا تو پانچ بجے تھے۔ جہاز میرا انتظار کر کے جا چکا تھا۔

سر جھکا آگیا، اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ فرخ امین دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے، کہنے لگے کہ اگر قائدِ اعظم کو معلوم ہو گیا کہ تم یہاں ہو، تو مارے گئے ہم سب۔ ان کا حکم تھا کہ وہ جہاز تمہارے بہن بھائیوں کو لئے بغیر لاہور واپس نہ آئے۔ اب کیا ہوگا؟

اے، ڈی، سی بھی کچھ سہمے، لیکن بحریہ کے افسر تھے، خوف زدہ نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ آپ مجھے دِلّی کا پتہ دیجئے، میں کوشش کرتا ہوں۔ دو پتے تھے، میں نے دونوں لکھ دئے اور دو بہنیں، اُن کے دو شوہر، آٹھ نو بچے، دو سوتیلے بھائی، اور ایک بہن، سب کی گنتی بھی گنا دی۔ اُنہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اے، ڈی، سی کو ٹیلیفون کیا، اتفاق سے وہ بھی بحریہ کا افسر تھا، دونوں میں برادرانہ گفتگو ہوئی، اُس کے

بعد یہ ہدایات دی گئیں کہ یہ جہاز بغیر اس قافلہ کے دِلّی سے روانہ ہونے نہ پائے۔
اگلے روز صبح دس بجے کے قریب دفتر میں ٹیلیفون آیا کہ آپ کے بہن بھائی دِلّی سے آ گئے ہیں، اور گورنمنٹ ہاؤس کی ٹرانسپورٹ اُن کو آپ کے مکان واقع ماڈل ٹاؤن تک پہنچانے کے لئے تعینات کر دی گئی ہے۔
ایک صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ اُس وقت کے اے ڈی سی آج کے ایڈمرل احسن ہیں، جو پاک بحریہ کے کمانڈر انچیف رہ کر اب مشرقی پاکستان کے گورنر ہیں۔ میں اُن سے اِس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا، مگر اِس موضوع پر ابھی تک گفتگو نہیں ہو سکی۔

کس درجہ بلند معیار تھا قائدِ اعظم کے قول و فعل کی مطابقت کا، اور میری ادنیٰ سی خدمات کے اُنھوں نے کیسے کیسے بیش بہا صِلے عطا فرمائے۔ زمانہ ایسے قدرداں شاذ و نادر ہی پیدا کیا کرتا ہے۔

فسٹ پرائز

(ریڈیائی ڈرامہ جو ۱۹۴۶ء میں الٰہ آباد میں لکھا گیا
اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کئی بار نشر ہوا)

(آتے ہوئے قدموں کی آہٹ)

شاہد : نجمہ، نجمہ ——— (ذرا اونچی آواز میں) ——— نجمہ ——— بھئی بہرے پن کی بھی حد ہونی چاہیئے ——— (دروازہ کھلنے کی آواز) ——— تو یہاں ہو تم۔ اچھا، ذرا جلدی سے چائے تو تیار کرا دو، مجھے باہر جانا ہے۔

نجمہ : توبہ ہے، دو لفظ لکھنے مشکل کر دئے۔ کیا عادت پائی ہے، ماشاءاللہ!

ش : ماشاءاللہ کا یہ کیا موقع ——— (کاغذ کھنکنے کی آواز) ——— اچھا تو یہ کہو کہ کچھ تحریر فرمایا جا رہا ہے۔ یہ ہر وقت کا لکھنا، عجیب بات ہے!

ن : عجیب کی اس میں کیا بات ہے گویا میں تو بس ایک جاہل ہوں جاہل، عورت کے معنی ہی یہ ہیں کہ بس جاہل ——— جہلِ مرکّب۔

ش : جہلِ مرکب، یہاں بالکل بے موقع رہا۔ مگر ——— پان سات روز سے مسلسل قلم کی گھس گھس، کچھ معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔

ن : سمجھ میں کیوں آنے لگا آپ کی سمجھ میں آئے ہانڈی کی چھُن چھُن، اور مشین کی ٹھک ٹھک ——— ٹھک ٹھک ——— ٹھک ٹھک!

ش : ارے واہ تم تو خواہ مخواہ تیز ہوئی چلی جا رہی ہو۔ آخر معاملہ کیا ہے ؟

ن : معاملہ کیا ہے، آتے ہی ہُلڑ مچا دیا، پھر کہتے ہیں معاملہ کیا ہے۔

ش : لاحول ولا، مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی وصیت نامہ تحریر ہو رہا ہے، یا کسی مقدمہ کا فیصلہ قلم بند کیا جا رہا ہے ——— (لہجہ بدل کر) ——— اب بتا بھی چکو آخر بات کیا ہے ؟

ن : بات یہ ہے کہ کل ایک لائن رہ گئی تھی، بس لے کے دماغ چٹ ہی تو کر دیا۔

ش : اچھا بابا معاف کرو، میں اِدھر بیٹھا جاتا ہوں، تم اپنی دستاویز مکمل کر لو۔ لیکن ذرا بندو کو تو آواز دے دو، چائے کے لئے : مجھے جلدی ہے۔

ن : بُندو، او بُندو ——— (بُندو کی آواز ——— جی بیگم صاحب) ——— ذرا انگیٹھی میں آگ تو کر دے جھٹ پٹ۔ ہاں تو بات یہ ہوئی کہ . . . . .

ش : ارے پہلے اپنی لائن تو پوری کر لو۔

ن : (بے پروائی سے) ——— ہوتی رہے گی، بس دو تین ہی لفظ تو باقی ہیں، اور کچھ ڈیش۔

ش : واللہ کمال کر دیا ——— اور کچھ ڈیش ——— ماشاء اللہ، کیا کوئی ادبیت بگھاری جا رہی ہے ؟ یہ آخر تمہیں سوجھی کیا، انجمہ!

ن : بس یہی باتیں تو مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ دوسرے کی سُنتا ہی نہیں کرتے ——— (رازدارانہ لہجہ میں) ——— یہ جو ہمارے برابر میں رہتی ہیں نا . . . . . .

ش : کون، اشرف کی ماں ؟

ن : اُونھ، اُس بڑھیا پھونس کا کیا ذکر تھا۔ اِدھر بائیں ہاتھ۔

ش : اچھا، مسز انور۔ تو پھر ؟

ن : پھر یہی کہ نہ جانے کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔

ش : جو ہے وہی سمجھتی ہو گی غریب۔

ن : جی، کیا ٹھکانا ہے اُس کی غریبی کا۔ مارے غرور کے سچ کہتی ہوں آپے میں نہیں۔ سمجھتی ہے، بس میرے برابر کوئی شاعر، کوئی ادیب، پیدا ہی نہیں ہوا۔

ش : مگر اس میں شک نہیں کہ ہے اچھے لکھنے والوں میں۔

ن : خاک، کیا اچھے لکھنے والوں میں ہے۔ دو تین اُلٹے سیدھے قصّے گھڑ لئے، کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے، مردوں نے عورت کے سمجھ کر سر آنکھوں پر لئے، چلو دیبہ جلیبہ بن گئیں۔

ش : (ہنستے ہوئے) —— چلو یوں سہی، مگر اس تمہید سے مطلب ؟

ن : مطلب یہی کہ بس جب جاؤ، وہی پرانے دُکھڑے —— (نقل اتارتے ہوئے) —— کیا کروں بہن، ناک میں دم ہے اِن ایڈیٹروں کے تقاضوں سے۔ صبح سے شام تک لکھوں —— چوبیس گھنٹے لکھتی رہوں، پھر بھی پورے نہیں ہوتے!

(تیزی سے) —— اللہ جانے میں تو تنگ آگئی ہوں اس کی اِن شیخیوں سے۔ اپنے آپ ہی تو ایسے ویسے ذکر نکالے گی، ادب کے، شاعری کے، پھر کوئی کچھ بول پڑے تو ایسے ہنسے گی جیسے سب احمق ہی تو ہیں۔

ش : تو تم ایسی بات میں دخل ہی کیوں دیتی ہو جو تم جانتی نہیں۔

ن : (تیزی سے) کیا نہیں جانتی میں، سیکڑوں قصّے پڑھ کر پھینک دئے ہوں گے، اور لکھنے کا کیا ہے، زندگی میں ہر طرف قصّے ہی قصّے۔ ذرا سا سلیقہ اور فرصت چاہئے۔ یہی بات بی صاحبہ کے سامنے میرے مُنہ سے نکل گئی —— بس کچھ نہ پوچھو، جل بُھن کر خاک ہی تو ہو گئی۔ اب تو قائل ہو گی!

ش : (ہنستے ہوئے) —— تو تم نے کوئی قصّہ وصّہ لکھ ڈالا ہے، خوب!

ن : (نہایت سنجیدگی سے) —— قصّہ وِصّہ کیا، پچھلے ہی بُدھ کا تو ذکر ہے۔ میں نے پردہ باغ چلنے کو کہا تو بڑے نخرے سے ایک رسالہ دکھ کر بولیں: بہن مقابلہ

کے لئے افسانہ لکھنا ہے۔ میرے بھی کچھ دِل میں آہی گئی۔ رسالہ اس کے ہاتھ سے لے گھر آئی، اعلان دیکھا، تین انعام تھے۔ بس اللہ دے اور بندہ لے بسم اللہ کر کے بیٹھ ہی تو گئی۔

ش : (قہقہہ لگا کر) —— واللہ حد کر دی نجمہ، تم تو چھپی رستم نکلیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔

ن : (بے رُخی سے) —— کیوں دیکھوں، نہیں دیکھ سکتے! —— (کاغذ لپیٹنے کی آواز)۔

ش : تم تو ایسے چھپا رہی ہو گویا میں کھا ہی تو جاؤں گا —— کیا میرے ہی متعلق کچھ لکھ ڈالا۔

ن : آپ کی تو ہر بات میں بدگمانی چلتی ہے۔ اُٹھئے، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔

ش : دیر نہیں ہوتی، لاؤ تو اِدھر۔

ن : کیا لاؤں؟

ش : یہی —— (ہنس کر) —— دفترِ بے معنی!

ن : (خفگی سے) —— رہنے دیجئے، کیا کریں گے خرافات میں سر کھپا کر —— (دو قدم چلنے کی آواز)۔

ش : (حیرت سے) —— کیا واقعی نہیں دکھانا —— (قدرے سختی سے) —— جانتی ہو میری بلا اجازت یہ کاغذات ایک انچ نہیں سَرک سکتے۔

ن : (بھرائی ہوئی آواز میں) —— وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی، اِس گھر میں کچھ ہو سکتا ہے۔ لیجئے میں قصہ ہی پاک کئے دیتی ہوں —— (کاغذوں کی چرچراہٹ)۔

ش : ہیں ہیں، پاگل ہوئی ہو نجمہ —— (لہجہ بدل کر) —— آخر کچھ کہا بھی تو ہوئیں نے۔ نہیں دکھاتیں، تمہاری خوشی۔ تمہارے ہی بھلے کو کہتا تھا۔

ن : (نرم ہو کر) —— کیا بھلا ہوگا میرا؟

ش : یہی کہ بغیر میرے دیکھے انعام معلوم!

ن : جی ہاں!

ش : جی ہاں، وی ہاں، تو میں جانتا نہیں، ہاں یہ جانتا ہوں کہ ادیبہ جلیلہ عورتیں ہمیشہ پرائے کندھے سے بندوق داغتی ہیں!

ن : کیا مطلب؟

ش : مطلب یہ کہ مسز انور تک غریب انور کے بل پڑنا چاہتی ہے۔

ن : (حیرت اور خوشی سے) —— واقعی!

ش : (بناوٹی سنجیدگی سے) —— جی نہیں، بکواس کر رہا ہوں۔

ن : مگر آپ کو قصّے کہانیوں سے کیا واسطہ؟

ش : تمہیں بہت ہے۔ خیر جانے دو۔ مگر نجمہ، یہ کہے دیتا ہوں —— اور وہ بھی دعوے سے —— کہ میرے قلم کی دو جنبشیں تمہیں فسٹ پرائز کا مستحق بنا دیں گی۔ فسٹ پرائز کا، سُنا!

ن : (بچّوں کے سے لہجہ میں) —— آپ تو بہکاتے ہیں۔

ش : اب بتاؤ میں بدگمانی کرتا ہوں، یا تم۔ اچھا، یوں نہیں، تو چلو کوئی شرط بدلو۔

ن : (رعب میں آکر) —— تو ٹھہریئے، میں لائن پوری کر لوں۔

ش : ہاں ہاں۔

(کاغذ کھنکنے کی آواز)

ن : یہ لیجئے۔

ش : اچھا، جتنے میں تمہاری یہ بکواس دیکھوں، اتنے تم چائے بناؤ۔

ن : دیکھئے، آئندہ میں ایسی باتیں نہیں سنوں گی۔

(وقفہ)

ن : اب آبھی چکئے، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ نگوڑا ذرا سا تو قصّہ تھا —— (ٹھہر کر) —— یہ آپ ڈھونڈ کیا رہے ہیں، کوئی ورقہ تو نہیں گما دیا؟

ش : جی، ورقہ ہی گم ہوگیا، جبھی تو انجام غائب ہے۔

ن : اے ہے ایسا غضب تو نہ کرو، ابھی تو لائن پوری کرکے دیا ہے۔

ش : وہ صفحہ تو موجود ہے۔

ن : پھر، وہی تو ہے خاتمہ۔

ش : واللہ، عجیب خاتمہ ہے۔

ن : کیا عجائبات لگ گئی آخر؟

ش : معلوم ہوتا ہے یکایک ریڈیو کی گھنڈی گھوم گئی، اور الفاظ منہ کے منہ میں رہ گئے!

ن : ایسے ہی تو ہوتے ہیں آجکل کے افسانوں کے انجام —— حیرت انگیز!

ش : حیرت تو مجھے کہیں نظر نہیں آئی، البتہ ہائی ہوئی کافی سے زیادہ ہے۔

ن : بندر کیا جانے ادرک کا بھاؤ۔ آپ فائلوں کے کیڑے، چلے ہیں ادب میں باقاعدگی ڈھونڈنے۔ اچھے افسانے ہمیشہ آنسو، آہ، چیخ، غشی . . . . . .

ش : . . . . . . مرگی، لقوہ، فالج . . . . .

ن : یا کسی ایسی ہی حرکت پر ختم ہوتے ہیں۔

ش : گویا افسانے نہ ہوئے میرے اور آپ کے جھگڑے ہوئے!

ن : (غصہ سے) —— میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی، ہمیشہ کی طرح طعن!

ش : تان تو تمہارے آنسوؤں کے بغیر ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

ن : (بھرائی ہوئی آواز میں) —— خاک پڑے ایسی اصلاح پر، لائیے ادھر، نہیں چاہیئے مجھے فسٹ پرائز۔

ش : کر دیا نا پھر تم نے رونا شروع۔

ن : روؤں نہیں تو کیا ہنسوں، رونا ہی قسمت میں لکھا ہے!

ش : قسمت میں نہیں، بلکہ میری منحوس شکل پر۔

ن : منحوس شکل تو میری ہے، جبھی تو گھر میں گھستے ہی تیور بدل جاتے ہیں۔

ش : (تیزی سے) —— تم نے مجھے گھر سے باہر دیکھا ہے؟

ن : خدا دیکھا نہیں، عقل سے تو پہچانا ہے۔ ایسی صورت سے آپ دوستوں میں بیٹھیں تو کون روادار ہونے لگا۔

ش : معاف کیجئے، میرے دوستوں کا مذاق آپ جیسا اعلیٰ نہیں، اُن کو تو میں روتا بسورتا ہی اچھا لگتا ہوں۔

ن : آپ کو کوئی اچھا لگے گا تو آپ کسی کو اچھے کیوں نہ لگیں گے۔

ش : (چیخ کر) —— اچھا بس ختم کرو، میرا وقت مفت کا نہیں ہے۔

ن : تو آپ کا وقت لیتا ہی کون ہے۔ بس دے دیجئے اِدھر، ہو چکی اصلاح۔

ش : یہ اب کہہ رہی ہو، جب دماغ کا تیل نکلوا لیا۔ ذرا آ کر تو دیکھو، بالشت بھر کے صفحہ میں پچھتر جگہ کاٹ چھانٹ کرنی پڑی ہے۔

ن : ارے، یہ آپ نے اچھے بھلے قصّے کی کیا گت بنا ڈالی۔ یہ اصلاح ہے یا دودھاری تلوار —— (بے قراری سے) —— رہنے دیجئے، رحم کیجئے اس غریب پر —— (کاغذ کھینچنے کی آواز)۔

ش : یہ کیا کرتی ہو بھئی، ایک منٹ صبر کرو۔ سچ کہتا ہوں، ایسا انجام دماغ میں آیا ہے، اگر لکھ دیا تو فسٹ، ورنہ سیکنڈ پرائز تو کہیں گیا ہی نہیں۔

ن : بھاڑ میں جائے سیکنڈ پرائز، میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا —— (روتی آواز میں) —— یہ لیجئے، ہائے اللہ دِل کا خون کر کے پورے ایک دن میں یہ مکالمہ لکھا تھا، اور آپ نے کس مزے سے اُس پر لکیر کھینچ دی، گویا بکواس ہے۔

ش : بکواس، واللہ الفاظ کے موزوں استعمال میں تو کافی ہوشیار ہو۔

ن : یہ آپ اصلاح کر رہے ہیں یا دشمنی؟

ش : ساتھ کے ساتھ تمہاری بھی اصلاح ہو جائے تو کوئی حرج نہیں —— (منہ بنا کر) —— اُونھ، پھر دی کھچڑی، نہ جانے کیا کیا لکھ مارا ہے —— (کاٹنے کی آواز)۔

ن : (چیخ کر) —— یہ کم بخت قلم رُکے گا یا نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں، دے دیجئے اِدھر ورنہ . . . . (رُک کر بھرائی ہوئی آواز میں) —— سارے مکالمے آپ کی

نذر ہو گئے۔ بتائیے تو اب اس میں کیا رہ گیا؟

ش : (ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے) —— میں پوچھتا ہوں رہنے کو اس میں تھا ہی کیا!

ن : کچھ نہیں تھا تو سیدھی طرح پھاڑ کر پھینک دیجئے، قصہ پاک ہو۔

ش : (نرمی سے) —— نجمہ، بے وقوف مت بنو، تم اناڑی ہو، بھلا بتاؤ میاں بیوی کی گفتگو میں اتنی رنگینی کی کیا ضرورت تھی، گویا میاں بیوی نہیں کوئی —— بس کیا کہا جائے —— کس قدر بھدّی سی چیز ہے۔

ن : (نقل اُتارتے ہوئے) —— میاں بیوی کی گفتگو میں رنگینی کی کیا ضرورت تھی —— (زہر خند) —— یہ بھی ایک ہی رہی، جیسے سارے دنیا جہان کے میاں انہی جیسے تو ہوتے ہیں، خشک، اکھڑ......

ش : نہ سہی، پر تم نے تو مجھے دیکھا ہے، میری سی باتیں لکھ دی ہوتیں۔ سارے جہان کے میاں بیویوں سے تمہیں مطلب؟

ن : اچھی منطق ہے! آخر میں دنیا میں نہیں رہتی، یا میں اندھی ہوں، بہری ہوں۔ کیسے کیسے میاں دنیا میں ہوتے ہیں، نوج کوئی تم جیسا ہو!

ش : (تمسخر سے) —— صرف رشک سے کام نہیں چلتا، کچھ کر کے دکھاؤ تو جانیں۔

ن : آپ چپ نہیں رہیں گے۔ خاک پڑے ایسی اصلاح پر، میں گالیاں نہیں سن سکتی۔

ش : (سکون سے) —— کچھ ہی کرو، پر نجمہ، یہ مکالمے ہرگز ٹھیک نہیں، زیادہ ضد کرو گی تو یاد رکھو فسٹ، سیکنڈ تو کیا، تھرڈ پرائز بھی نہیں ملیگا۔

ن : مجھے نہیں چاہیئے پرائز۔ یہ لیجئے، بھلا اس فقرے میں کیا زہر تھا، تین دفعہ تو خود میں نے کاٹ کر ٹھیک کیا تھا۔

ش : ہوں، کیا زہر تھا! آخر معلوم بھی تو ہو، اچھا بھلا آدمی بیٹھے بٹھائے کیوں بے ہوش ہو گیا۔ نہ اس کو مرگی نہ ہسٹیریا، نہ دھڑکن نہ اختلاج!

ن : میں کہتی ہوں، آخر یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ جانتے ہیں نہیں قصہ کہتے کس بلا کو

ہیں، اور کرنے چلے ہیں اصلاح —— حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا نگوڑے کا ——
(لہجہ بدل کر) —— زہرہ چلی گئی تھی اس لئے بے ہوش ہوا۔

ش : کسی کے جانے سے کوئی بیہوش ہوتا ہے، واللہ ایک سے ایک نئی بات سوجھتی ہے تمہیں۔

ن : (سنجیدگی سے) —— محبت میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ش : تم محبت کے معاملات میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو —— یہ ایک اور انکشاف!

ن : (بے تابانہ) —— خدا سمجھے تم مردوں سے، خود جھک ماریں شاعری میں، بکواس کریں ادب کے نام پر، اور غریب عورت کے منہ سے لفظ نکلا نہیں کہ تو چل اور میں آیا۔ . . . . .

ش : (بات کاٹ کر) —— چلو جانے دو، یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ مگر نجمہ، یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ اِن باتوں کا نام قصہ ہے۔ غیر فطری . . . . . .

ن : (چیخ کر) —— للہ، بس کیجئے۔ میں بس کی گانٹھ کا خاتمہ ہی کئے دیتی ہوں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری —— (کاغذوں کی چرچراہٹ)۔

ش : اُف فوہ، یہ کیا کرتی ہو بھئی نجمہ۔ اپنے ساتھ میری محنت بھی غارت کئے دیتی ہو۔ انجام تو دیکھو، کیسا کر دیا ہے میں نے۔ واللہ، جان پڑ گئی ہے جان!

ن : اب آیا نا اپنی محنت کا درد، دوسروں کے تو جیسے جان ہی نہیں۔ دو حرف لکھ دئے تو کیسا جوش آ رہا ہے، اور میرے صفحے کے صفحے کاٹ کر پھینک دئے —— (ذرا ٹھہر کر غصہ سے) —— اور یہ انجام، ہاں مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ پھانسی پر کون چڑھے، لکھ کر ہی ارمان پورا کرو!

ش : (حیرت سے) —— کیسا ارمان، تمہیں دَورہ تو نہیں پڑ رہا ہے نجمہ!

ن : بیوی کو مار کر ہی چین آیا نا۔ وہ تو . . . . . .

ش : لاحول ولا قوۃ، عقل کے پیچھے بالکل ہی ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو نجمہ! دیکھتی نہیں ہو، آخر میں بیوی کی موت نے قصے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ——

(کھٹ کھٹ کی آواز)۔

ن : اب چپ بھی رہیے، یہ اشرف کی ماں نہ معلوم اِس وقت کہاں سے آن مری۔

(کچھ دِن بعد)

ش : یادوشت، پہلے اِدھر مجھے تو دکھاتی جاؤ، آخر ہے کیا؟

ن : (خوشی سے) —— ہوتا کیا، وہی انعام! ذرا دکھا تو آؤں، حیران رہ جائے گی!

ش : اُف فو، ایسی بھی کیا بے تابی، دیکھنے تو دو، سیکنڈ ہے یا فسٹ؟

ن : جی ہاں، فسٹ! کچھ مرتو نکال دیا غریب کا کاٹ کاٹ کر، پھر کہتے ہیں فسٹ ——
(آہستہ سے) —— سیکنڈ ہے، سیکنڈ۔

ش : (فخریہ) —— میں تو پہلے ہی جانتا تھا، میری اِصلاح . . . .

ن : (بات کاٹ کر) ہاں ہاں، آپ کی اصلاح، ورنہ فسٹ نہ آتا!

ش : شاباش، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میری مان کر تو دی نہیں۔

ن : اِس ہٹ دھرمی کا علاج؟ کیا نہیں مانا میں نے؟؟ یہ میرے ماننے ہی کا تو نتیجہ ہے ورنہ . . . .

ش : (بے تحاشا ہنستے ہوئے) —— ورنہ فسٹ، چہ خوش! یہ پتہ نہیں کہ پھر بھی سیکڑوں خامیاں باقی تھیں جو تمہارے فضیتے کی وجہ سے میں نے چھوڑ دیں۔

ن : جب خوبیاں کٹ گئیں تو خامیاں ہی باقی رہتیں —— (آہ بھر کر) —— ایسے ایسے جواہر پاروں پر آپ نے قلم کی آری چلائی ہے جن کو لکھتے وقت میں خود جھوم جھوم گئی تھی۔

ش : جواہر پارے! واللہ، برعکس نہند نام زنگی کافور۔ انجام کے متعلق تمہاری ضد مان لیتا تو دیکھتا کیسے اس وقت مسز انور کو چڑانے چلتیں۔

ن : انجام نگوڑے میں ایسی کونسی اپچ تھی جو سب کا ٹھیکہ دار بن بیٹھا، غنیمت ہوا کہ اڑا اڑ کر میں نے تھوڑے بہت فقرے بچا لئے، ورنہ میں تو کچھ ایسی ہو گئی تھی، جو آپ نے کر دیا بس ٹھیک۔

ش : اُن ناہنجار فقروں ہی کا تو کارنامہ ہے کہ "ٹاپ" سے چوک گئیں۔

(کسی کے اندر آنے کی آواز)

بندو : بیگم صاحبہ، یہ چٹھی۔

ن : چٹھی! لاؤ، ارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسز انور نے دی ہے کیا ؟

بندو : جی نہیں، ڈاکیا دے گیا ہے۔

ن : ہائیں، یہ ایک اور لفافہ کیوں ؟

ش : ایسا ہی لفافہ! دکھاؤ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی، حد کردی نجمہ، یہ پہلا لفافہ تو مسز انور کے نام ہے۔

ن : (سہم کر) —— اور یہ دوسرا؟

ش : سچ ہے، خوشی اور رنج میں حواس گم ہوجاتے ہیں، دیکھ نہیں رہی ہو، یہ تمہارے نام ہے۔ کھول بھی چکو۔ غالباً "فسٹ" میں تو پہلے ہی جانتا تھا، میری اصلاح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ن : (نہایت سنجیدگی سے) —— بالکل چپ رہیئے، اور وعدہ کیجئے کہ اب کے نتیجہ پر کچھ نہیں بولیں گے، جب کھولوں گی۔

ش : تم نہیں بولوگی تو مجھے کیا باولے کُتّے نے کاٹا ہے۔

(لفافہ کھلنے کی آواز)

ن : (دبی ہوئی آواز میں) —— اوہ، افسانہ ناپسند!

ش : (حیرت سے) —— کیا، افسانہ ناپسند ؟

ن : (گلا صاف کرتے ہوئے، غصہ سے) —— لیجئے، چاٹئے ایسے انجام کو —— (کاغذ پھینکنے کی آواز)۔

ش : (کھسیانہ پن سے) —— تم وعدہ خلافی کر رہی ہو تو میں بھی کہتا ہوں کہ گلے کا ہار بنائیے اپنے باقیماندہ جواہر پاروں کو۔

عید کی دُعا

مجاہد حسین

(یہ دُعا آج سے پچاس سال پہلے کی گئی، یا لکھی گئی اور "زمیندار" لاہور کے عید الاضحیٰ نمبر ۱۳۴۸ھ میں شائع ہوئی)

مخزنِ صلح و آشتی کی کلید
ہم ہیں اسباقِ زیست کی تمہید

ہوتی رہتی ہے ہر طرح ہم کو
پائمالیٔ کفر کی تاکید

عید کا چاند ایک ذریعہ ہے
ہم کو منظور ہے ہماری دید

دید وہ جس سے دینِ فطرت کے
زورِ بازو کی ہوتی ہے تائید

یا الٰہی، ہمیں مسلماں رکھ،
کہ مسلماں کی ہر گھڑی ہے عید!

۔ "جنگ" کراچی کے عیدالفطر ایڈیشن ۱۳۹۸ھ میں بھی شائع ہوئی۔

بہ بیں تفاوتِ رہ ......

(ایک واقعہ جو اپریل ۱۹۷۲ء میں اسلام آباد میں پیش آیا)

قوانین کی مسودہ نگاری اور عرائض نویسی میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہ ایک پرانا مقولہ ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ قوانین کی مسودہ نگاری آئین کی مسودہ نگاری سے بھی بدرجہا مشکل ہوتی ہے، کیونکہ قوانین کو آئینی اصولوں کا پابند کرنا پڑتا ہے جبکہ آئین اس قسم کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

بہرحال ایک مسودہ کی تیاری میں ایک ایسے بزرگ سے سابقہ پڑا جو ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قوم نہ کبھی ترقی کر سکتی ہے، اور نہ اس کو ترقی کرنے کا کوئی حق حاصل ہے۔ ان کا تعلق کبھی عدلیہ سے رہا تھا، اور وہ اپنی مسودہ نگاری پر ضرورت سے ذرا زیادہ ہی مطمئن نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی غلطی پر اسٹینوگرافر سے اُلجھ پڑے۔ کہنے لگے کہ عدلیہ میں تجھے کوئی

چپراسی بھی نہ رکھے، یہاں اسٹینوگرافر بنا پھرتا ہے۔ اسٹینوگرافر نے مجھ سے شکایت کی اور کہا کہ دیکھئے صاحب، یہ غلطی ان کی تھی یا میری۔ میں نے مسودہ کو شروع سے آخر تک کئی بار دیکھا، چاروں کونوں سے چوکس تھا۔ میں نے کہا غلطی مسودہ میں تو نہیں تھی، اب ہو گئی ہے، اس کو ویسا ہی کر دو۔

چند دن بعد ایک عشائیہ میں مجھے اُن کے برابر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے کہا ۱۹۶۴ء کے ایک عشائیہ کی یاد تازہ ہو گئی، جو کراچی کے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں کسی کی طرف سے کسی کو دیا گیا تھا۔ مسٹر جسٹس خمیسانی اور میں پاس پاس بیٹھے تھے۔

میرے دوست بہت خوش ہوئے، اور کہنے لگے کہ ہم بھی کسی مسٹر جسٹس سے کم نہیں ہیں۔

"اچھا تو پھر کیا ہوا، سناؤ کچھ باتیں خمیسانی کی، مر گیا بیچارہ، اچھا آدمی تھا۔"

"اچھا آدمی تھا! آپ اور مرحوم کو ان الفاظ سے یاد فرمائیں، عجیب بات ہے۔"

"اس میں عجیب کی کیا بات ہے، وہ ہائی کورٹ کا جج تھا۔"

میں نے کہا کہ جیسے میں تمہارے کان میں کہہ رہا ہوں، اسی طرح مسٹر جسٹس خمیسانی نے مجھ سے کہا:

"مجاہد صاحب، آپ ان صاحب کو جانتے ہیں جو مہمان خصوصی سے متوجہ ہیں؟"

"جی ہاں، ممتاز حسن صاحب ہیں، فنانس سیکرٹری تھے کبھی ہمارے۔"

"کیا یہ کبھی سندھ اکاؤنٹس کے کنٹرولر بھی رہے ہیں؟"

"ضرور رہے ہوں گے، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے آدمی ہیں۔"

"کیا آپ مجھے ان سے ملا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔"

کھانے کے بعد مسٹر جسٹس خمیسانی سایہ کی طرح میرے ساتھ رہے یہاں تک کہ میں

ممتاز حسن صاحب تک جا پہنچا۔ اپنی روایتی شفقت سے پیش آئے، فرمانے لگے:

"کیسے ہو، کیا کر رہے ہو۔ سُنا تھا کہ ریٹائر ہو کر پریکٹس کرنے لگے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ مسٹر جسٹس خمیسانی سے تو واقف ہوں گے؟" میں نے خمیسانی صاحب کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ سے کون واقف نہیں"! ممتاز حسن صاحب نے بڑے جوش سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"خمیسانی صاحب دریافت کر رہے تھے کہ کیا آپ کبھی سندھ کے کنٹرولر بھی رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ ع یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!"

"معلوم ہے اس وقت مسٹر جسٹس خمیسانی نے کیا کہا؟" میں نے اپنے دوست سے سوال کیا۔

"کیا کہا؟"

"مسٹر جسٹس خمیسانی نے کہا کہ جناب والا، اُس وقت میں آپ کا اسٹینو ٹائپسٹ تھا!"

میں نے اپنے دوست سے کہا کہ اس کے بعد جو کچھ وہاں گزری، میں تمھیں بتانا نہیں چاہتا، کیونکہ۔ ع

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

یہ کہہ کر میں نے کافی کی پیالی اٹھائی اور اپنے دوست کی زد سے کافی دُور نکل گیا۔

صُبیح مجُاھد، شملہؔ کی کسی چوٹی پر



(شادی کے کچھ بعد : ۱۹۳۵ء)

.....مہرباں کیسے کیسے

(افسانہ جو "اخبار خواتین" کراچی
مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا)

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دینے کے بعد اُس نے سوتی ہوئی مُنّی کو اچھی طرح دوہرے کمبل میں لپیٹ کر کندھے سے لگایا اور مُنّے کو بازو سے سہارا دے کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ کمرے کے شیشوں سے روشنی چھن رہی تھی اور باتوں کی آوازیں چلی آرہی تھیں۔ بول تو سبھی رہے تھے مگر سسر کی آواز سب سے بلند تھی جو کہہ رہے تھے "حد ہوگئی صاحب، روزانہ کا یہی قصّہ ہے جب دیکھو گھر سے غائب۔ بیماری اور موت کہاں نہیں ہوتی مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ ساتھ میں جیتے لوگ بھی مرجائیں۔ یہ سب صاحبزادے صاحب کی کمزوری ہے۔" فوراً ہی بعد ساس صاحبہ کی آواز بلند ہوئی "اے ایک اماں انھی کی تو نرالی نہیں ہیں۔ اماں ابا کس لڑکی کے نہیں ہوتے مگر نکاح کے دو بولوں کے بعد غیر واصل ہو جاتے ہیں یہی شرافت ہے۔"

باتیں اس کے لئے نئی نہ تھیں، مگر پھر بھی اُس کے اُٹھے ہوئے قدم جم کر رہ گئے۔ اور شدید سردی کے باوجود اس کی پیشانی پسینہ سے تر ہوگئی۔ دراصل سسرال والوں کی پریشانی اور

تیمارداری نے اُس کے اعصاب کو بُری طرح متاثر کر دیا تھا اور یہ مزید بار بڑا گراں تھا۔ آخرکار اس نے ڈرتے ڈرتے کواڑوں کو دھکا دیا۔ غالباً دروازہ پورا کھلنے سے پہلے ہی سب لوگ جا چکے تھے، کیونکہ صرف اس کا شوہر تیز تیز قدموں سے چکر لگا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کے جسم میں جھرجھری آگئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ انداز علامت ہے کہ نصیبِ دشمناں طبیعت قابو میں نہیں۔ نہایت خاموشی سے مُنّی کو بستر پر لٹا کر، مُنّے کو لئے ہوئے آہستہ سے پنگوڑے کی طرف بڑھی تو باوجود کوشش کے شوہر سے نظریں نہ بچ سکیں، جو غالباً اسی کے منتظر تھے۔ فوراً چبھتے ہوئے لہجہ میں بولے "بڑی جلدی خیال آگیا واپسی کا۔"

موقع کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے بڑی نرمی بلکہ قدرے لجاجت سے اس نے جواب دیا "آج امی کی طبیعت زیادہ خراب تھی، پھر ٹیکسی دیر میں ملی۔" آگے وہ یہ نہ کہہ سکی کہ اگر وہ گاڑی بھیج دیتا تو یقیناً واپسی ایک گھنٹہ پہلے ہو جاتی۔

"مگر یہ روز روز کی جھنجھٹ، جیسے اپنا گھر تو گھر ہی نہیں ہے!"

وہ غصہ سے کھول گئی۔ اُس نے سوچا اگر معاملہ اپنی ماں کا ہوتا تو دیکھتے کہ جناب کتنی دیر اپنے گھر کی محبت میں مبتلا رہتے۔

مگر تین چار سال کے قلیل عرصہ میں، اِس طرح وہ نہ معلوم کتنی بار کھولی تھی اور ایسی کتنی ہی باتیں اس نے سوچی تھیں۔ بس سوچی ہی تھیں! نہایت ضبط اور آہستگی سے وہ صرف اتنا کہہ سکی "ابھی چند ہی روز سے تو ایسا ہوا ہے۔" آپ سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ امی کی حالت نازک ہے اور انہیں تیمارداری کی سخت ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر کیا سارے زمانے کا درد سمیٹنے کے لئے آپ ہی رہ گئی ہیں، وہ آپ کے بھائی بھاوج کیا ہوئے؟"

وہ اِس کج بحثی کی عادی ہو چکی تھی۔ لہٰذا خاموشی سے غسل خانے کی طرف مڑ گئی۔

واپسی پر شوہر کو سوتا پا کر اس نے روشنی بند کی اور مُنّی کے برابر لیٹی کیا گر پڑی۔ اس کا بدن پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور تھکان کی زیادتی سے رگیں تن کر گویا ٹوٹنے کو تھیں، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ کمرے کی بھیانک تاریکی

میں صرف ایک ہی چہرہ ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ کفن کی طرح سفید اور خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد چہرہ جس کی خشک سطح پر گڑھوں میں اتری ہوئی صرف دو آنکھیں زندگی کا ثبوت باقی رہ گئی تھیں۔ ممتا، لگن، درد اور لافانی محبت کا نور برسانے والی یہ آنکھیں جن کی روشن رہنمائی میں اس نے اپنا سارا بچپن اور جوانی کا ایک قیمتی حصہ گزارا تھا۔ یہ آنکھیں نہیں، دو ایسے انمول چراغ تھے جنھوں نے زندگی کی ہولناک اور تیرہ و تار راہوں کو مدت تک منوّر کیا تھا اور مصائب و حوادث کی تیز آندھیاں بھی ان کو بجھا نہ سکی تھیں۔ مگر اب یہ چراغ مسلسل محنت، بیماری، دوا اور غذا کی قلت سے ٹمٹما کر ختم ہو رہے تھے!

اس کو بخوبی اندازہ تھا کہ آج سے زیادہ اس کی ماں کو خدمت اور دولت کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی اور یہ حقیقت تھی کہ یہ دونوں چیزیں فراوانی سے اس کے خود کے پاس تھیں، مگر گیا وہ ان دونوں چیزوں کے استعمال کی مختار تھی۔ تمام گزشتہ اور موجودہ تجربات اس بات کے شاہد تھے کہ کسی مبالغہ کے بغیر اس کی حیثیت ایک محتاج اور فقیر کے برابر کہی جا سکتی تھی۔ نہ وقت اس کا اپنا تھا، نہ وہ کسی کام کی مختار تھی، اور دولت کی تو وہ صرف امین تھی۔ انہی سردیوں کی تو بات تھی، شاپنگ کے درمیان دوکان پر پھیلے ہوئے بے شمار سوئٹروں کو دیکھ کر اس کو اپنی ماں کا ٹھٹھرتا ہوا جسم یاد آ گیا تھا اور اس نے بلا تامل دوکان دار کو ایک موٹا سا سوئٹر اپنی کوٹ کے ساتھ پیک کرنے کی ہدایت کی تھی، تو اُس کے شوہر کے چہرے پر ناگواری کے جذبات باوجود کوشش کے چھپ نہ سکے تھے، اور اُس نے اُسی وقت عہد کر لیا تھا کہ آئندہ وہ ایسی ذلت کسی قیمت پر گوارا نہ کرے گی ——— اور اس کی ماں نے بھی تو کہا تھا: "بیٹی تم نے ناحق تکلیف کی۔ جانتی ہو، میں ان چیزوں کی عادی نہیں۔"

ٹھیک ہی تو کہا تھا ماں نے، بھلا وہ کب کسی تکلف کی عادی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کبھی اپنی ماں کو کسی قسم کا آرام اُٹھاتے نہ دیکھا تھا۔ وہ تو بس یہ دیکھتی آئی تھی کہ ماں یا تو باورچی خانے میں ہوتی ہے یا پھر سلائی کی مشین پر۔ وہ سارا دن محلے والوں کے کپڑے سیتی اور اس طرح اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی۔ اس نے نہ کبھی ماں کو آرام کرتے دیکھا تھا اور

نہ اس کے جسم پر اچھا لباس۔ زیور کا تو ذکر ہی کیا۔ بھیا تو خیر چھوٹا بھی تھا اور کھلنڈرا اور ناسمجھ بھی، مگر وہ تو شروع ہی سے بے حد حساس اور زود رنج لڑکی تھی۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا، جب بھی اس کی امّی مشین روک کر تکان کے مارے گہرے گہرے سانس لیتیں تو وہ ان کے گلے سے لپٹ کر بڑی خوشامد سے کہتی: "اچھی امّی! اس طرح تمام دن مشین نہ چلایا کیجئے۔ دیکھئے نا آس پاس کوئی بھی تو اتنی دیر تک نہیں چلاتا۔" جواب میں اس کی امّی ساری افسردگی ایک پھیکی مسکراہٹ میں چھپا کر جواب دیتیں:

"مگر پھر ہم سب کھائیں گے کہاں سے اور تم دونوں پڑھو گے کیسے"؟

امّی تو صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتیں، مگر اس کا چھوٹا سا دماغ جیسے شروع ہو جاتا، وہ سوچے جاتی۔ جس طرح اور جس حد تک اس کی کچی عقل ساتھ دیتی اور روح فرسا حقیقتیں اس پر واضح ہوتی چلی جاتیں۔ واقعی ان کے حالات آس پاس کے تمام گھرانوں سے مختلف تھے۔ وہاں باپ بھی تھے اور بھائی بھی، بلکہ اور بھی کئی طرح کے رشتہ دار اور عزیز۔ اس کے علاوہ بھی زندگی کی کئی خوشنما راہیں اور ذریعے۔ یہاں کیا تھا، ایک چٹیل میدان۔ ایک دفعہ تو وہ مایوسیوں میں گھر کر بے دم سی ہو جاتی، مگر جلد ہی فطرت انسانی کے مطابق ایک موہوم سا مگر دلآویز مستقبل اس کے وجود کے ساتھ لپٹ کر ناامیدی کے اس اتھاہ سمندر میں تنکے کی طرح سہارا دیتا اور وہ خیالی پلاؤ پکانے لگتی۔ وہ پڑھے گی، پڑھے جائے گی، خوب دل لگا کر ——— پھر وہ اپنی ہیڈ مسٹریس کی طرح بغیر کسی دوسرے سہارے کے اپنی چھوٹی سی خوب صورت دنیا تخلیق کرے گی۔

جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی، اس کے ارادے پختہ ہوتے چلے گئے۔ اب وہ ماں کی تکان پر، اس کے گلے میں جھولنے کی بجائے، کتاب پر جھکی جھکی صرف بڑبڑا کر رہ جاتی: "بس تھوڑے دن اور امّی! صرف تھوڑے دن اور، پھر ———"

اور پھر واقعی اس کی خوابوں کی تعبیریں ظاہر ہونے لگیں۔ ڈگری والے امتحان میں شاندار کامیابی، دو سال کا اسکالرشپ اور مزید برآں پروفیسری کا وعدہ۔ کئی کئی بار سننے اور بار بار پوچھ گچھ کے باوجود اس کو یقین نہ آتا تھا، اور اپنے حواسوں پر شک تھا۔ آج مدت کے

بعد اس نے پھر اپنی امی کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔ مگر یہ کیا! وہ تو آج سے پہلے ہی بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ کیا اس سے پہلے کسی اور نے یہ خبریں ان تک پہنچا دی تھیں۔ وہ جھنجھلا سی گئی۔

"امی کیا آپ میری کامیابی سن چکی ہیں"! اور یہ کہہ کر اس نے ایک ہی سانس میں اپنی کامیابیوں کی شاندار تفصیل سنا ڈالی۔

امی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ اسکالر شپ! کیا تم اور آگے پڑھو گی"؟

"اور نہیں تو کیا کروں گی"؟

فرطِ حیرت سے وہ روہانسی ہو کر چیخی۔ امی پھر اپنی سنجیدہ موڈ میں آ گئیں۔ مگر آج ان کی سنجیدگی میں بھی عجیب سا سرور اور اطمینان تھا۔

"بیٹی، کیا کرو گی آگے پڑھ کر۔ اب تو تمہاری شادی کا فرض ادا کرنا ہے' ایک اچھا سا رشتہ مل گیا ہے"۔

اگر کوئی اس کو بتاتا کہ بھیا چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے' یا وہ کالج سے نکال دی گئی ہے' تو بھی غم و غصہ سے اس کی یہ حالت نہ ہو سکتی تھی۔ وہ ہسٹیریائی انداز میں چیخی:

"شادی، رشتہ، امی، آپ نے یہ سب کچھ کر لیا ہے مجھ سے پوچھے . . . "

"میں نے کہاں کر لیا' وہ تو از خود' بے طلب آ گیا۔ تم جانتی تو ہو' وہ سوسائٹی میں سفید بنگلے والے تمہارے والد کے دوست۔ کتنے اچھے ہیں وہ لوگ اور کتنا پیارا ہے ان کا وہ لڑکا۔ دولت کے ساتھ انسانیت آج کل کہاں ملتی ہے۔ یہ سب خدا کی عنایت ہے' اور بیٹی خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمت کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے"۔

"مگر امی وہ میرے بلند ارادے' میرے حسین خواب' میں پڑھوں گی' ملازمت کروں گی' بھیا کو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیجوں گی! اور امی کی ساری مصیبتوں' بدبختیوں کا بدلہ چکا دوں گی۔ کیا میرے یہ سارے خواب، خواب ہی رہیں گے۔ اوہ ــــــ" اس کا گلا رندھ گیا اور وہ ماں کی گود

میں سر چھپا کر سسکنے لگی: "نہیں نہیں امی ایسا کبھی نہ ہوگا، میں یہ سب ہرگز نہ ہونے دوں گی۔" ماں کی آغوش اس کے آنسوؤں سے اور اس کا سر ماں کے آنسوؤں سے تر ہوگیا۔

انجام کار شکست اسی کو ہونی تھی۔ اس کی آہ و فریاد اور گریہ و زاری سب رائیگاں گئی۔ ماں کی مظلومیت اور التجاؤں کے آگے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر بھی اپنی دو باتیں اس نے منوالیں، تعلیم کی تکمیل تک شادی کا التوا اور شادی کے بعد ملازمت کا اختیار، اور اس طرح بزعمِ خود مطمئن ہوگئی۔

مگر شادی کے بعد اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کی ملازمت قائم نہیں رہ سکتی، اور دو چیزوں میں سے ایک کی قربانی لازمی ہے۔ ملازمت یا گھر کا سکون! اس نے خاموشی سے ملازمت کی یا زیادہ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیئے، اپنی قربانی دے دی۔

پھر بھیا اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک دفتر میں کلرک بن گیا۔ ماں نے تنہائی اور دوہری مصروفیت سے تنگ آکر بیٹے کی شادی رچائی اور بے چاری بہو کو چولھے چکی کے چاک گریباں کا بخیہ بنا کر، خود بدستور مشین پر جھک گئی۔ . . . . . اور جب تلے اوپر وارد ہونے والے بھتیجے اور بھتیجیوں میں کلرکی اور سلائی کی مشترکہ آمدنی تبرک ہوکر رہ گئی تو ماں کی زندگی کا چراغ بھڑکا اور جھلملا کر بجھنے لگا۔

منّی کی چیخ پکار سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ سرہانے والی کھڑکی کے پردے سے سورج کی کرنیں چھن رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ رات کو دیر تک جاگتے رہنے سے وہ دن چڑھے تک سوتی رہی تھی۔ اس کا شوہر دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا! اور بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا:

"اس وقت امی کے ہاں نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان آرہے ہیں۔ ہاں شام کو ہم دونوں چلیں گے اور دیر تک ٹھہریں گے۔"

تجویز، باوجود دلآویز مسکراہٹ اور شیریں لہجے کے بڑی گراں تھی، مگر وہ مان گئی، خندہ پیشانی سے، اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ شام کو تھکان سے، حسبِ معمول شوہر صاحب کا موڈ بالکل آف تھا، ایسا کہ وہ چلنے کو تو کیا کہتی، ملازم بھیج کر طبیعت پچھوانے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ اس کو کیا معلوم کہ بے چارہ بھیا بھاگ کر کے اُن کو دفتر میں ماں کی نازک حالت کا ٹیلیفون کر چکا ہے۔ جس کا ذکر یا تو وہ مصلحت

کے خلاف سمجھے یا بھول گئے۔

اور اگلی صبح یہ ڈگمگاتی ہوئی ناؤ اس کے پہنچنے سے پہلے تہ آب ہوگئی۔ اس نے بھیا بھاوج سے سب کچھ سنا۔ کس طرح ماں اس کا انتظار کرتی رہی اور وہ لوگ اس امید میں رہے کہ روزانہ کی طرح وہ اپنے وقت پر آتے گی اور وقت نکلنے پر ٹیلیفون کیا تو اس جواب سے مطمئن ہوگئے کہ ہم لوگ ابھی ابھی پہنچ رہے ہیں، اور آخر کار اسی "ابھی" نے ماں کی دروازے پر لگی ہوئی آنکھوں کو بند کردیا!

وہ چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی اور ایک آتش فشاں اس کے سینے میں بھڑکتا رہا—— بس بھڑکتا ہی رہا، پھٹا نہیں!

شام کے دھندلکے میں، وہ گھر کی چھت پر کھڑی ہوئی مِل کے سامنے پھیلے ہوئے میدان میں جمع ہونے والے ہجوم کو دیکھ رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ سینکڑوں مزدور، مِل سے نکل نکل کر، پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے ہجوم میں شامل ہو رہے تھے۔ مِل میں ہڑتال ہوگئی تھی ایک اُونچے کولتار کے ڈرم پر کھڑے ہوئے نوجوان کے الفاظ سے اُس کو پتہ چلا کہ ایک مزدور کو اُس کے باپ کی بیماری پر چھٹی نہ دے کر مِل مالک نے یہ آفت مول لی تھی، کیونکہ سوئے اتفاق سے باپ، بیٹے کی عدم موجودگی میں ختم ہوگیا تھا۔ ڈرم پر کھڑا ہوا نوجوان کہہ رہا تھا:

"مزدور طبقے سے زیادہ مظلوم رُوئے زمین پر کوئی دوسرا گروہ نہ ملے گا۔ جس کی زندگی تو زندگی موت بھی موت نہیں رہی۔ مگر اب ہم جاگنے لگے ہیں۔ ہم میں عزتِ نفس اور بنیادی حقوق کا شعور بیدار ہو رہا ہے، جن کے بغیر انسان، حیوان ہی نہیں، بلکہ کیچڑ میں رینگنے والے کیڑے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اب ہم سرمایہ داروں کو تباہ دینا چاہتے ہیں۔"

اِس سے آگے وہ کچھ نہ سن سکی، الفاظ اس کے دہکتے ہوئے دماغ میں رانگے کی طرح پگھل گئے اور اس کے دل کی بھیانک چیخیں ہر آواز پر غالب آگئیں۔ ان چیخوں سے بچنے کے لئے وہ زینے کی طرف بھاگی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی، مگر اس کے دل و دماغ جیسے چیخے جارہے تھے،

"یہ زمانہ، یہ مبارک زمانہ، جب ہر گرا ہوا اُبھر کر بڑی طاقتوں کو للکار رہا ہے۔ تم عورتیں، بے چاری عورتیں، سوئی ہوئی ہو، مزے میں، ذلّت کے گہوارے کو اورنگِ سلیمان سمجھ کر" !

اس نے ہتھیلیوں سے اپنی پھٹتی ہوئی کنپٹیاں دبا لیں۔ آدھے زینے پر پہنچ کر وہ قدرے ٹھٹکی۔ درمیانی منزل کے قریبی کمرے میں، اس کا سسر اس کے خاوند کو جواب دے رہا تھا، جو ابھی ابھی باہر سے آیا تھا، اور مل مالک کے فعل پر سخت مشتعل تھا:

"ہاں، نہ معلوم کب ہوش آئے گا اِن سرمایہ داروں کو، گویا ان نالائقوں کو تو بیماری اور موت نہیں آنی۔ دراصل دولت اور طاقت انسان کو درندہ بنا دیتی ہے۔"

لیکچر طویل تھا مگر ——— وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ سامنے صحن میں اس کی ساس، جو صبح سے نہ معلوم کتنے خانساماؤں کا انٹرویو لے چکی تھیں، اس وقت بھی ایک خانساماں سے سوال جواب میں مصروف تھیں۔ وہی لگے بندھے سوالات، پہلی جگہ کیوں چھوڑی، کیا تنخواہ تھی وغیرہ وغیرہ۔

خانساماں جواب دے رہا تھا "سرکار، ہمارا قصور نہیں۔ ہم نے پورے پانچ سال خدمت کی۔ کوئی بے ایمانی، نمک حرامی نہیں کی۔ بس ذرا بیوی بیمار ہو گئی تھی، اس کی دیکھ بھال کو کبھی کبھی کوارٹر جانا پڑتا تھا۔ کام میں حرج ہوتا تھا، ڈانٹ پڑتی تھی۔ میں نے کہا سرکار، عیوضی رکھ دوں، کچھ دِنوں کے لئے۔ نہیں مانے کہ مہمان آتے ہوئے ہیں، نئے ملازم سے تکلیف ہو گی۔ تو میں نے عرض کی حضور، اتنی چھٹی دے دو کہ عورت کو گھر چھوڑ آؤں، یہاں اکیلی مر جائے گی۔ بہت ناراض ہوئے، میں نے تکرار کی تو صاف جواب دے دیا، تو حضور ہاتھ بیچے ہیں، جان نہیں بیچی"۔

ساس اِس ساری کتھا پر حیرت اور نفرت کا ایک مؤثر پوز بنا کر چیخیں: "اُوئی، خدا کی مار، وہ لوگ اِنسان تھے یا حیوان۔ نہ جان کا خیال، نہ محبت اور رشتے کا پاس، الٰہی توبہ!"

اُس کا پھٹتا ہوا سر بھک سے اُڑنے کے قریب تھا۔ غم و غصہ کی لہریں رگوں کو جھنجھنائے دے رہی تھیں۔ وہ چکراتی ہوئی کمرے میں پہنچی، اور دھم سے بستر پر گر پڑی۔

ممتاز حسنؒ مرحوم

(روز نامہ جنگ کراچی،
مورخہ ۴ نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا)

ممتاز حسن صاحب کی رحلت ایک ایسا سانحہ ہے جس کے دوررس اثرات کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اُن کو جانتے ہوں۔ اور ان کو کون نہیں جانتا!

بہر حال، میری پہلی ملاقات اُن سے انڈین لیجیلیٹو اسمبلی کی آفیشل گیلری میں ہوئی۔ غالباً ۱۹۴۶ء میں جب وہ فنانس ممبر کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور میں لا ممبر کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ صاحبِ ذوق تھے۔ دفتری باتوں کی جگہ شعروشاعری ہوا کرتی تھی۔ علامہ اقبال مرحوم کے خاص مداحوں میں تھے۔

پاکستان میں ان سے ۱۹۴۸ء میں ایک کام سے ملنا ہوا، جب میں وزارتِ قانون میں اٹاشی تھا اور مرحوم فنانس منسٹری میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ وُہ مجھ سے عمر میں تین سال بڑے تھے، عہدوں میں بھی ہمیشہ بڑے رہے۔ مگر جس دھڑلّے سے اُنھوں نے بحیثیت ڈپٹی سیکرٹری احکامات جاری کئے تھے، میں نے آئندہ پندرہ سال کی ملازمت میں وہ بات بڑے سے بڑے افسر میں بھی نہیں پائی۔

۱۹۵۱ء میں اُن کا مجھے دہلی میں خط ملا، وہ اس وقت فنانس کے جائنٹ سکریٹری تھے۔ اور میں ہائی کمیشن میں متروکہ املاک کا لائزن آفیسر بر تبہ فرسٹ سکریٹری تھا۔ اگر وہ چاہتے تو ہائی کمشنر صاحب کو براہِ راست خط لکھ سکتے تھے، لیکن انہوں نے مجھ جیسے ایک کم حیثیت شخص کو یاد فرمایا۔ خط میں لکھا تھا کہ کراچی میں حلقۂ اربابِ ذوق کے زیرِ اہتمام ایک آل انڈیا پاکستان مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ فلاں فلاں شعرا کو دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں۔ اُن کو کراچی بھجوانے کا انتظام میں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ جب مشاعرہ ہو چکا تو ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کو انھوں نے پھر مجھے خط لکھا، میرا اور میرے اسٹاف کا شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر آپ بھی شریکِ مشاعرہ ہوتے، جو واقعی بے حد کامیاب رہا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو مشاعرہ کے بعد پوچھتا بھی نہیں۔ بڑے باوضع دوستوں میں تھے۔

آخری خط جو اُن کا مجھے ملا، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۴ء کا تھا۔ اس کو پڑھ کر مجھے یہ خدشہ ہوا تھا کہ شاید وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں۔ لیکن جب میں اُن کا شکریہ ادا کرنے گیا تو مجھے یہ معلوم کر کے ذرا اطمینان سا ہوا تھا کہ وہ باوجود بیگم صاحبہ کے انتقال کے اپنی گوناگوں مصروفیات میں حسبِ سابق بڑے جوش و خروش سے دلچسپی لئے چلے جا رہے تھے۔

"ایک نیا فریضہ جو میرے ذمہ کر دیا گیا ہے حیدرآباد ٹرسٹ سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے میں ایک سوسائٹی قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہا ہوں، جس کے لئے قواعد و ضوابط مرتب کرنے ہیں۔ میں نے کچھ لکھ لیا ہے، کچھ لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ ایک نظر دیکھ لیں تو پھر آگے چلا جائے۔"

وہ اس قدر آگے چلے گئے کہ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

دراصل بیگم صاحبہ کی موت کے بعد ان کا جی دُنیا میں لگتا کچھ بند سا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ان کے ۲۰ ستمبر والے خط سے ظاہر تھا۔ ضروری اقتباسات ملاحظہ فرما کر خود

ء۔ صفحہ ۲۱

نتیجہ اخذ کیجیے :

"دوست عزیز و محترم۔ میں تقریباً تین ہفتے ملک سے باہر رہا ہوں۔ واپس آیا تو "رُوحوں کے رشتے" کا ایک نسخہ میز پر رکھا ہوا ملا۔ میں نے پڑھا۔

"میاں بیوی کے رشتے کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے میں اس سے حرف بہ حرف متفق ہوں۔ محبت وہ تعلق ہے جسے موت نہیں مٹا سکتی۔ مگر میاں بیوی کی محبت کو ابھی تک اُردو ادب نے پوری طرح سے قبول نہیں کیا۔ ہمارے ہاں کا مقبول ادیب اکثر و بیشتر وہ ہے جو دوسرے کی بہو بیٹیوں کے قصیدے لکھے اور اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتے۔

"میری اپنی بیوی کا انتقال پچھلے دسمبر میں ہوا۔ اس وقت تک میری جو ذہنی اور روحانی کیفیت ہے اُسے آپ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کی جو کیفیت ہے اسے میں سمجھ سکتا ہوں۔ وہ میری بنتِ عم تھیں۔ بچپن اکٹھا گزرا۔ ایک ہی گھر میں بڑھے، کھیلے اور لڑے جھگڑے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ ہم دونوں کی شادی ہو گی تو اسے نہ انہوں نے ناپسند کیا نہ میں نے۔ تقریباً زندگی کے پینسٹھ سال اکٹھے گزرے۔ جو گھر انہوں نے بنایا وہاں باہر کی دُنیا کی ہوا و ہوس، بغض و حسد اور فتنہ و فساد کو جگہ نہ تھی۔ گھر پہنچ کر میں محسوس کرتا تھا کہ قلعہ بند ہو گیا ہوں۔ اور اب ہر غنیم کے حملے سے محفوظ ہوں۔

"اب اگر کوئی اطمینان ہے تو یہ کہ اگر ان کی جگہ میں چلا جاتا تو کیا ان کی بیوگی کا تصور میرے لئے قابلِ قبول ہوتا۔ آپ نے بھی یہ لکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہے۔ وہ سہاگن تھیں سہاگن گئیں۔ اب زندگی کیسے گزرے گی، کوشش کر رہا ہوں اپنے آپ کو مصروف رکھوں اور جہاں تک توفیق ہو ان کے نیک کاموں کو جاری رکھوں۔ ان کی دو مصروفیات سب سے زیادہ تھیں ایک تو بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرانا اور دوسرے بچوں بچیوں کو سکولوں کالجوں میں داخلہ دلوانا۔ اس میں صحیح غلط کا کوئی سوال نہیں تھا۔ آدمی غریب ہے اور بے روزگار ہے تو اسے ہر حال میں ملازمت ملنی چاہیئے۔ لڑکا لڑکی

پڑھنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی سکول یا کالج انہیں داخلہ نہ دے۔

"یہ میں نے اپنی داستان خواہ مخواہ چھیڑ دی آپ کی ہمت ہے کہ آپ نے سات سال گزار دیئے ہیں، مجھ سے تو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں گزرا۔ میرا ارادہ ہے کہ ان پر کچھ لکھوں۔ آپ کی کتاب نے اس ارادہ کو اور بھی تقویت پہنچائی ہے۔

"قائدِ اعظم کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بجائے خود ایک یادگار چیز ہے۔ میں بھی مختصراً کچھ لکھ رہا ہوں۔

مخلص قدیم

ممتاز حسن"

کچھ "تحدیثِ نعمت" سے

(بعض اخبارات کے قائدِ اعظم سالگرہ نمبر
کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھا گیا)

چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی اُردو میں قلم بند فرما کر جہاں زبان پر احسانِ عظیم کیا ہے، وہاں اُن کو "تحدیثِ نعمت" کے زیرِ عنوان شائع کر کے اُردو داں طبقہ کو نتیجہ خیز واقعات کی ایک بیش بہا نعمت سے مالامال کر دیا ہے۔ "تحدیثِ نعمت" دسمبر ۱۹۷۱ء میں جبارت پرنٹرز، لاہور، نے چھاپی، اور عجیب اتفاق ہے کہ ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن، ڈھاکہ، اس کے ناشر قرار پائے! یہی نہیں، چودھری صاحب نے اس کتاب کے جملہ حقوق بھی اسی ایسوسی کو عطا فرما دیئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چودھری صاحب کو سقوطِ ڈھاکہ کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

"تحدیثِ نعمت" سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن میرا مقصد اس پر تبصرہ کرنا نہیں ہے، بلکہ محض آج سے تیس سال پہلے کے ایک واقعہ کی تصدیق کرنا ہے، جو کتاب کے صفحہ نمبر ۴۳۲ پر مندرج ہے، اور جس کا تعلق سر سیّد سلطان احمد صاحب کی بحیثیت وزیر

قانون تقرری سے ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ میں ۱۹۴۱ء میں چودھری صاحب کا، اور ۱۹۴۲ء میں سر سلطان کا پرسنل اسسٹنٹ رہا، اور اس سے قبل کم و بیش تین سال تک مسٹر جناح کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے، اور سر سلطان بہار کی پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے۔ مسلم لیگ کے نصب العین میں اس وقت یہ اصول بھی شامل تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت کوئی عہدہ قبول نہ کیا جائے۔

چودھری صاحب کے پاس دو وزارتیں تھیں، ایک قانون، دوسری سپلائی۔ انہوں نے فیڈرل کورٹ کے جج ہونے کو ان دونوں پر ترجیح دی۔ فرماتے ہیں:

"وائسرائے نے مجھ سے مشورہ کیا کہ تمہارے جانے پر وزیر قانون اور وزیر سپلائی رکن اصحاب کو مقرر کیا جائے۔ وزارت قانون کے لئے میں نے سر سید سلطان احمد صاحب کا نام پیش کیا، اور وزارتِ سپلائی کے لئے سر ہومی مودی کا۔ وائسرائے نے دونوں کے متعلق پسندیدگی کا اظہار کیا، اور کہا ان دونوں سے دریافت کرو کہ وہ نئی کونسل میں شامل ہونے کو تیار ہوں گے ...... میں پٹنے جا کر سر سید سلطان احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا میرے لئے یہاں سے نکلنا مشکل ہے لیکن اگر تمہاری خواہش ہے اور وائسرائے رضامند ہیں تو مجھے عذر نہیں"۔

سر سلطان نے یہ نہیں کہا کہ اگر مسٹر جناح نے اجازت دے دی تو مجھے عذر نہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسٹر جناح اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں، اور ان کی اجازت ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ مسٹر جناح نے چودھری صاحب کے اس طرح سر سلطان کو وزارتِ قانون پر آمادہ کرنے کو "ورغلانا" ہی تصور نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف سمجھا۔ بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ سر سلطان تو مسلم لیگ سے خارج کر دئے گئے، اور چودھری صاحب اور مسٹر جناح میں اچھی خاصی مخالفت پیدا ہو گئی۔

مجھے اس کا علم اُس وقت ہوا جب ایک مرتبہ مسٹر جناح، سر سلطان اور چودھری صاحب تینوں بیک وقت حیدر آباد میں تشریف فرما ہوئے۔ میں اُس وقت چودھری صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ سکندر آباد میں ہمارے میزبان ایک بہت بڑے سوداگر تھے جو چودھری صاحب کے خاص دوست تھے۔ صبح ناشتہ پر ان کے ہاں مسٹر جناح اور سر سلطان کا ذکر چھڑا کہ دونوں حیدر آباد آئے ہوئے ہیں، ایک مقدمہ میں ایک دوسرے کے مدِمقابل کی حیثیت سے لیکن ایک آدھ پیشی کے بعد مسٹر جناح بیمار پڑ گئے ہیں اور ملنا جلنا قطعی بند ہے۔ اُسی روز میں مسٹر جناح کی عیادت کے لئے حاضر ہوا، وہ واقعی بیمار تھے اور بمشکل اٹھ بیٹھ سکتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد جب چودھری صاحب فیڈرل کورٹ چلے گئے اور میں سر سلطان کا پرسنل اسسٹنٹ ہوا، تو میں نے ایک دن قیام بمبئی کے دَوران اُن سے دریافت کیا کہ کیا مسٹر جناح اس پایہ کے وکیل نہیں ہیں جیسا کہ مشہور ہے، سُنا ہے کہ حیدر آباد میں آپ کے مقابلہ میں ایک مقدمہ ہارنے لگے تو بیمار پڑ گئے۔ سر سلطان نے مجھ پر ناپسندیدگی کی نظر ڈالی اور فرمایا:

"بڑے وکیل ہارا ہی کرتے ہیں۔ ع۔ وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔ وہ مقدمہ دُنیا کا کوئی وکیل نہیں جیت سکتا تھا۔ جناح خداداد قابلیت کے مالک ہیں، ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ یہ بات تم اُسی وقت سمجھ سکتے ہو جب خود وکالت کرو۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ مقدمہ ہارنے لگے تو بیمار پڑ گئے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مسٹر جناح کے نزدیک سر ظفر اللہ نے مجھے ورغلا کر مسلم لیگ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے، اور وہ ایسے موقع کے منتظر ہیں جب ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپیں"!

مسٹر جناح نے سر ظفر اللہ کی پیٹھ میں کس کس طرح چھرا گھونپا، اس کی تفصیل خود چودھری صاحب کی زبانی اگر سُنی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا:

"برطانوی وزیرِ اعظم نے اپنے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کے بیان میں تقسیمِ ملک کے منصوبہ کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے فیڈرل کورٹ آف انڈیا سے علیحدہ ہوجانا چاہیئے، چنانچہ میں نے اپنا استعفےٰ بھیج دیا کہ ۱ر جون سے میں عدالت سے علیحدہ ہوجاؤں گا۔ اُس وقت میرا ارادہ تھا کہ تقسیم کے بعد میں پہلے کی طرح لاہور میں وکالت کروں گا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اُن دنوں ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں صاحب والیٔ بھوپال دِلّی میں فروکش تھے۔ جب انہیں میرے ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا تم کچھ عرصہ کے لئے میرے پاس بھوپال آجاؤ تاکہ میں اس مشکل مرحلے میں جو والیانِ ریاست کو درپیش ہے تم سے مشورہ کرسکوں ...... جب آزادیٔ ہند کے ایکٹ کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش ہونے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ تم دو ہفتے کے لئے لندن چلے جاؤ، تمہاری وہاں بہت سے ارکانِ پارلیمنٹ سے شناسائی ہے۔ تم وہاں یہ جائزہ لینا کہ مسودے پر بحث کے دوران میں کیا کسی ایسی وضاحت کا امکان ہے جس سے نئے آئین میں والیانِ ریاست ہائے ہند کے حقوق کی حفاظت ہوسکے۔ اگر ایسا کوئی موقع ہو تو اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنا۔" تحدیثِ نعمت: ص ۴۹۷۔

"میں نواب صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں سفرِ انگلستان کے لئے تیار ہوا تو دلّی سے پیغام آیا کہ قائدِ اعظم نے طلب فرمایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ پنجاب میں جو کمیشن حد بندی کے لئے قائم کیا جانے والا ہے اس کے سامنے مسلم لیگ کی طرف سے وکالت کی ذمہ داری ہم تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں لیکن نواب صاحب کے ارشاد کے ماتحت میں عازمِ انگلستان ہونے والا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کمیشن کی کارروائی کب شروع ہوگی اور مجھے تیاری کے لئے کتنا وقت ملے گا۔

قائدِ اعظم:۔ تم انگلستان کتنا عرصہ ٹھہروگے؟

ظفر اللہ خاں:۔ میرا اندازہ تو پندرہ دِن کا ہے۔

قائدِاعظم :- پھر کوئی فکر نہیں۔ کمیشن کی کارروائی شروع ہونے میں ابھی خاصی دیر ہے۔ ابھی تو کوئی امپائر بھی مقرر نہیں ہوا۔

....

ظفر اللہ خاں :- میں لندن سے واپسی پر کراچی سے سیدھا لاہور چلا جاؤں گا، وہاں میں کس کو اپنی آمد سے مطلع کروں ؟

قائدِاعظم :- نواب ممدوٹ سب انتظام کریں گے۔" تحدیثِ نعمت : ص۴۹۸

"میں بحث کے سلسلہ میں ابھی لاہور ہی میں تھا کہ مجھے قائدِاعظم کا پیغام ملا کہ کمیشن سے فارغ ہونے کے بعد میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر بھوپال جاؤں۔ انہوں نے کمال شفقت سے شام کے کھانے کی دعوت دی، حاضر ہونے پر معانقہ کا شرف بخشا اور فرمایا میں تم سے بہت خوش ہوں اور تمہارا نہایت ممنون ہوں کہ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے اُسے اعلیٰ قابلیت سے اور نہایت احسن طریق سے سرانجام دیا۔ کھانے کے دوران میں طریقۂ تقسیم اور کارروائی تقسیم کے موضوع پر گفتگو رہی۔ آپ سے رخصت ہوکر میں بھوپال چلا گیا۔" تحدیثِ نعمت : ص۵۰۹۔

"آخر اگست ۱۹۴۷ء میں قائدِاعظم نے مجھے بھوپال سے کراچی طلب فرمایا۔ حاضر ہونے پر فرمایا، میر لائق علی حیدرآباد سے آئے تھے اور اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے پیغام لائے تھے کہ میں تمہیں صدرِاعظم کی حیثیت سے حیدرآباد جانے پر آمادہ کروں تاکہ تم اعلیٰ حضرت اور حکومتِ ہند کے درمیان مناسب سمجھوتے کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت کی واضح تحریر لائیں کہ جو مشورہ تم دو گے یا تجویز تم کرو گے وہ اعلیٰ حضرت قبول فرمائیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔ میں نے عرض کیا، میں تو کسی شرط پر بھی حیدرآباد جانے کے لئے تیار نہیں۔ فرمایا یہ صورت ہی پیدا نہیں ہوگی، کیونکہ اعلیٰ حضرت میری مطلوبہ تحریر نہیں

دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در اصل میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کرو۔" تحدیثِ نعمت ، ص ۵۱۸ ۔

مکراچی پہنچنے پر میں قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ ان کی خدمت میں زبانی عرض کر دی ۔ فرمایا اب تمہارا کیا پروگرام ہے ۔ میں نے عرض کی اب بھوپال جاؤں گا ۔ ذرا تیز لہجے میں فرمایا تم کب اِن مخمصوں سے فراغت حاصل کرو گے ؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمیں تمہاری یہاں ضرورت ہے ۔ میں نے عرض کی میں اگر کسی خدمت کے قابل ہوں تو حاضر ہوں ۔ پوچھا لاہور جاؤ گے ؟ عرض کیا لاہور رہتا ہوا بھوپال جاؤں گا ۔ فرمایا لیاقت علی خاں کی طبیعت علیل ہے ، وہ لاہور میں ہیں ، تم وہاں ان سے ملنا تعمیلِ ارشاد میں لاہور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ انہوں نے دورانِ گفتگو میں دریافت فرمایا ، قائدِ اعظم نے تمہارے ساتھ کوئی بات چیت کی ہے ؟ میں نے کہا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا تھا ۔

نواب زادہ صاحب :۔ صورت یہ ہے کہ ہمیں پاکستان میں سپریم کورٹ قائم کرنا ہوگا ۔ اس کے قواعد مرتب کرنے اور ججوں اور عملے کے انتخاب اور تقرر کے لئے تو کچھ وقت درکار ہوگا لیکن چیف جسٹس کا تقرر جلد ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان تمام امور پر غور کرنا شروع کرے ۔ ایک تجویز یہ ہے کہ تم پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا منصب سنبھالو اور ان امور کے متعلق غور کرنا شروع کرو ۔ پھر تقسیم پنجاب کے نتیجے میں جو ہل چل مچی ہے اور ابتری پیدا ہوئی ہے خصوصاً پناہ گزینوں کی بھرمار اور مختلف صیغہ جات کے افسران اور عملے میں جو خلا پیدا ہوا ان سب امور نے مِل جُل کر اس صوبے میں انتظامی حالت خراب کر دی ہے ۔ ممتاز دولتانہ سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں یہ اکیلے ان کے بس کی بات نہیں ۔ انہوں نے قائدِ اعظم سے کہا ہے کہ یہاں کسی بے لاگ اور صاحب عزم چیف منسٹر کی ضرورت ہے اور مشورہ دیا ہے کہ وہ تمہیں یہاں بھیج دیں ۔ تیسرے مرکز میں بھی آدمیوں کی ضرورت ہے ، علاوہ وزارتِ عظمٰی کے دفاع اور امورِ خارجہ کے قلمدان

بھی میرے سپرد ہیں۔ یہ بھی ایک شخص کا کام نہیں۔ تم چاہو تو مرکز میں آجاؤ۔ اِن سب باتوں پر غور کر کے تم اپنا منشاء مجھے بتا دینا۔

ظفر اللہ :۔ میں آپ کے ارشاد کے مطابق غور کرنے کے بعد حاضرِ خدمت ہو کر گزارش کر دوں گا۔

نواب زادہ صاحب :۔ میں نے سارا قصہ تم سے کہہ دیا ہے! اب تمہارے غور اور منشاء کی بس اتنی گنجائش ہے کہ تم بھوپال سے ہو کر جتنی جلدی ہو سکے کراچی پہنچ جاؤ۔"

تحدیثِ نعمت : ص۵۲۶۔ ۵۲۷۔

"ہم ۲۵ دسمبر کی سہ پہر کو کراچی پہنچے۔ عزیزہ امۃ الحی کے خالو بریگیڈیر غلام احمد صاحب کراچی میں تھے۔ عزیزہ اور اس کی والدہ تو ان کے ہاں ٹھہریں اور مجھے سیّد امجد علی صاحب کے ہاں ۱۸ وکٹوریہ روڈ میں ٹھہرنے کی جگہ مل گئی۔ وہ دن قائدِ اعظم کا یومِ پیدائش تھا۔ ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب تھی، میں وہاں حاضر ہو گیا لیکن مجھے ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ قائدِ اعظم نے میرے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے! البتہ نواب زادہ صاحب نے اتنا فرمایا کہ آج تمہیں حلف لینا ہو گا۔ قائدِ اعظم کی آمد پر نواب زادہ صاحب نے مجھے اس نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ان کے عین بائیں جانب تھی۔ قائدِ اعظم نے بیٹھتے ہی فرمایا، ظفر اللہ خاں وزیرِ خارجہ کے منصب کا حلف لے گا! اور میں نے تعمیلِ ارشاد میں حلف اٹھایا۔" تحدیثِ نعمت : ص۵۲۸۔

ملاحظہ فرمائیے آپ نے وار پر وار پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے! ان واقعات سے جہاں چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب کی قابلیت اور پاکستان کے لئے ان کے جذبۂ ایثار و وفاداری میں کسی قسم کی گنجائش نہیں رہتی، وہاں قائدِ اعظم کی وسعتِ نظر اور مردم شناسی کا ایک ایسا ثبوت ملتا ہے جو مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

صبیح مجاہدا اپنی بیٹی ایشیا کے ساتھ



(آخری تصویر : اپریل ۱۹۶۷ء)

پیروں کی کرامات

("تدارکِ امراضِ قلب

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا")

ڈاکٹر سید حسن نقوی صاحب کی مندرجہ بالا شوخ سرخی کے تحت جو مقالہ "جنگ" مورخہ ۳۱ جنوری ۷۴ء میں شائع ہوا ہے، اُس نے ایک پرانے واقعہ کی یاد تازہ کر دی، لیکن اس سے پہلے کہ میں اُس واقعہ کا ذکر کروں، یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے یہ مقالہ کچھ تدارکِ امراضِ قلب کی خاطر نہیں —— کیونکہ ع

"نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر (دل کا مرض) کیوں ہو"

—— بلکہ میر تقی میر کے شعر کی بلند پائیگی کے پیشِ نظر پڑھنا شروع کیا تھا، البتہ جوں جوں پڑھتا گیا دلچسپی بڑھتی گئی، اور ڈاکٹر حسن نقوی صاحب کے طرزِ تحریر کا قائل ہونا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے شعر و شاعری کے بعد چند "موڈرن سائنس کے مہیا کردہ دفاعی احتیاط" بتائے ہیں، مثلاً سگریٹ نہ پینا، مرغن غذائیں نہ کھانا، ورزش کرنا، تبدیلِ آب و ہوا

وغیرہ۔ آخری اشتہار یہ ہے:

"اور سب سے آخر اور سب سے ضروری بات وہ ہے جو ہم
سب جانتے ہیں کہ ہم انجان بنے ہوئے ہیں۔ یعنی ہمارا آپ
زندگی کی تصدیق اور مصنوعی دنیا میں اپنا دل تباہ کر رہے ہیں"
اور یہ سب نفسیاتی کشمکش اور اعصابی دباؤ، سماجی اور فکر کے
ساتھ ساتھ اور گھریلو کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا Stress
اور Stress ہمارے دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ میر تقی میر
تو دل حسینوں کے ہاتھ بیچ کر دل کا دکھ سہتے رہے مگر اب تو
ایسا لگتا ہے کہ دل جان کا دشمن بن گیا ہے اور اس سے
سائنسی معلومات سے آپ کی احتیاط سے زندگی میں اعتدال
سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کی بیداری پر آپ کی
زندگی کا انحصار ہے۔"

معاف کیجیے اس "دماغ کی بیداری" میں اُس واقعہ کی تبلیغ بھی ہے جسے واقعی تبلیغ کرنا چاہیے۔ تو یہ ذکر تھا غالباً ۱۹۷۰ء کا۔ آج سے بارہ برس پہلے۔ میں راولپنڈی کے ایک ڈاک بنگلہ میں قیام پذیر تھا۔ برابر والے کمرہ میں پیر احسن الدین صاحب مقیم تھے وہ اُس وقت چیف سیٹلمنٹ کمشنر تھے۔ آج کل بنگال میں کسی ممتاز عہدہ پر فائز ہیں۔ ایک دن شام کو میں باہر سے آیا تو وہ اس میں زندہ خاں محمود صاحب سے مصروفِ گفتگو تھے۔ زندہ خاں محمود اس وقت لینڈ اینڈ کنسٹرکشن کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ ایوب پارک اُن کا بنوایا ہوا ہے۔ زندہ دل دوستوں میں تھے۔ اب انتقال کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

پریشان تھے۔ اور موضوعِ گفتگو ڈاکٹروں کی تجویزیں تھیں۔ کہہ رہے تھے کہ سب

ڈاکٹر Stress اور Strain بتاتے ہیں، بعض Anxieties بھی کہتے ہیں (یعنی ادھیڑ بُن)، لیکن مختلف دواؤں کے علاوہ ایک دوا جس پر سب کا اتفاق ہے Tranquillizer ہے (یعنی کوئی ایسا مرکب جو سکون فراہم کر سکے)۔

پیر احسن الدین صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا لیجیئے، وہ آ گئے مجاہد صاحب، آپ ان سے دریافت کر لیجیئے۔ زندہ خاں محمود صاحب، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مسلمان کے لئے نماز سے بڑھ کر Tranquillizer آج تک دریافت نہیں ہوا۔ یہ مجاہد صاحب مسجد سے عصر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر آ رہے ہیں، ان سے پوچھ لیجیئے۔

مجھے اس سے پہلے اس چیز کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ نماز بھی Stress اور Strain کا علاج ہو سکتی ہے، جو ڈاکٹر سید حسن نقوی صاحب کے نزدیک امراضِ قلب کے دو اہم اسباب ہیں۔ اس کے بعد جب بھی کسی مشکل مرحلہ سے گزرنا پڑا میں نے اس نسخہ کو خاص طور پر آزمایا، اور بفضلہ تعالےٰ ہمیشہ مفید پایا۔

پیر پھر پیر ہوتے ہیں! آپ بھی آزما کر دیکھئے۔

"روحوں کے رشتے" کے مسودہ کا آخری صفحہ

بلند ہو رہی تھیں" ___ سینیہ اس کے دُکھ نہ سہہ سکی۔ وہ جلدی سے اس کی ہمدردی سے جو فقرہ
نینی بولی تھی نے نادانستہ اس کی پریشانی کم کر دی تھی ۔ اُسکو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے
کتنی محبت کرتی ہے ۔

سینیہ کو پاگل کر دینے کی دہشت چھپی تھی مگر تمام سینیہ ۔ ایک ننھا سا طفل
بھی کچھ طرح اسکے دماغ میں گونجا ہے ___ وہ فنا اپنی قسمت کے ہاتھ کی تمنّا کے
کمبل میں وہ پتی کے پاس کروٹوں سے ادھر ادھر اس کے حال کے آگے سی دو سوال اٹھنے جو شگون
سے بھیانک تھے ۔ تمہاری ماں کے باپ کو فنا کرتی ہو ۔ یہی انجان ہوں تو ملے کس کا ؟" حیرت زدہ
نینیز نے ماں کو دیکھتے کہا ۔" کیا ہوا ۔" سینیہ کی دوار چیخ سے نمایاں تھی ۔ مرتی
تب وہ کچھ لمحاتی صبح ہی چیل کر سینیہ کا جواب سمجھا ۔ تب سینیہ ہی بھلا کون تھا جو
جھجک ۔ اس سے پہلے کبھی کو یہ تحیر پیدا ہوا ہو کہ باپ کتنی بڑی نعمت ہے ۔ نینیز کے
خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں سینہ کے جذبات کو اندر سے اُسکو سیلاب اور
اور خوف سے بھلا کر دیا تھا ۔ سینہ کا سر سینا فتنہ خود ہر جگہ ہے اور
اُسے بہتر دار آنسوؤں نے جینی کے چہرے کو جیسے وہ جینی کے باپ کے علاوہ بھی
کبھی سمجھتی ہے یہ نیا رشتہ تھی ۔ دُعا ملنی تھا ___ غریب نینیز بھی کبھی کچھ
سمجھ ہی نہ سکی کہ ماں کے یہ آنسو کس سے تھے ؟

صبح مجاہد ۔

[illegible]

(حوالہ : صفحہ ۳۵)

ایک سانیٹ

اہلیۂ مرحومہ کے نام

مجاھد حسین

تُو نے جس دن سے نہ آنے کی قسم کھائی ہے
میں اُسی دن کی قسم کھا کے بتاتا ہوں تجھے
کہ میں گم گشتۂ منزل ہوں کچھ ایسا کہ مجھے
تیرے آنے یا نہ آنے سے سروکار نہیں

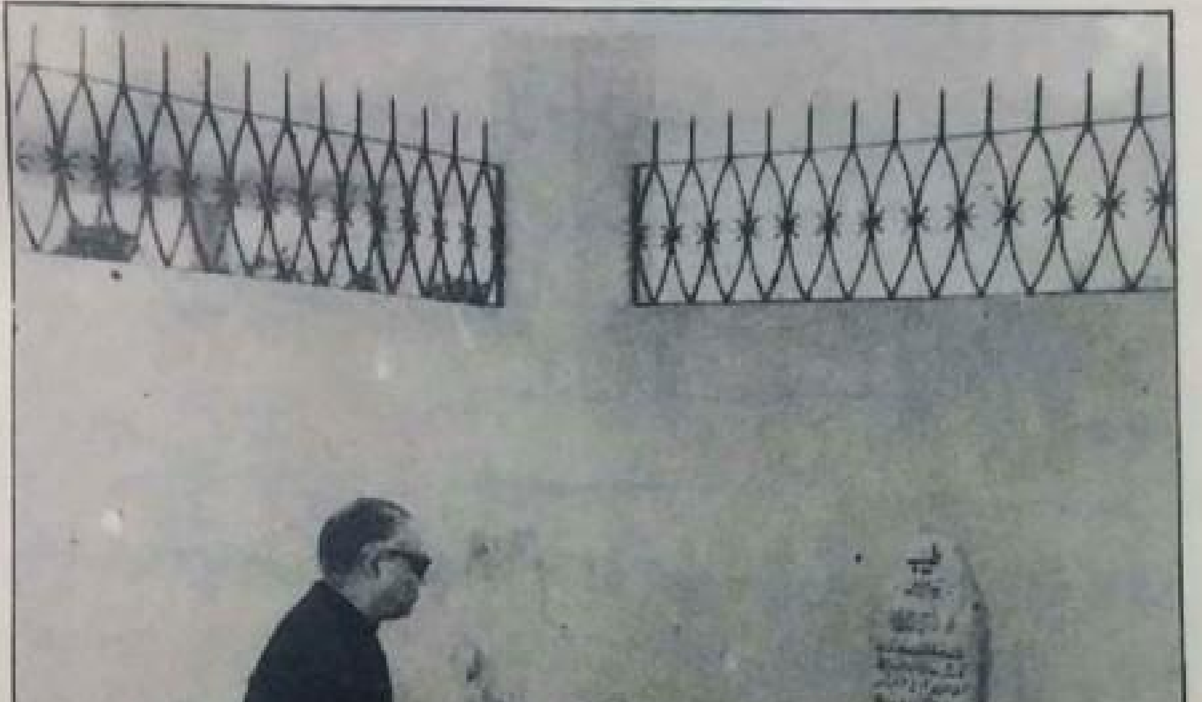
سوچتا ہوں کہ کبھی ساتھ تھا میرا تیرا
ہم سفر ایک ہی منزل کی طرف تھے دونوں
اور سمجھتے تھے یونہی چلتے رہیں گے برسوں
لیکن اب ساتھ ہے تیرا، نہ وہ منزل، نہ سفر

میں وہ گم گشتۂ منزل ہوں کہ ملنے پہ ترے
منزلیں چومتی رہتی تھیں قدم جس کے، مگر
روٹھ جانے پہ ترے، تیرے چلے جانے پر
کسی منزل کا پتہ ہے نہ خبر ہے اپنی

ڈھونڈنے کو جو نکلتا ہوں تو کھو جاتا ہوں
دُور سے دُور ہر اک گام پہ ہو جاتا ہوں

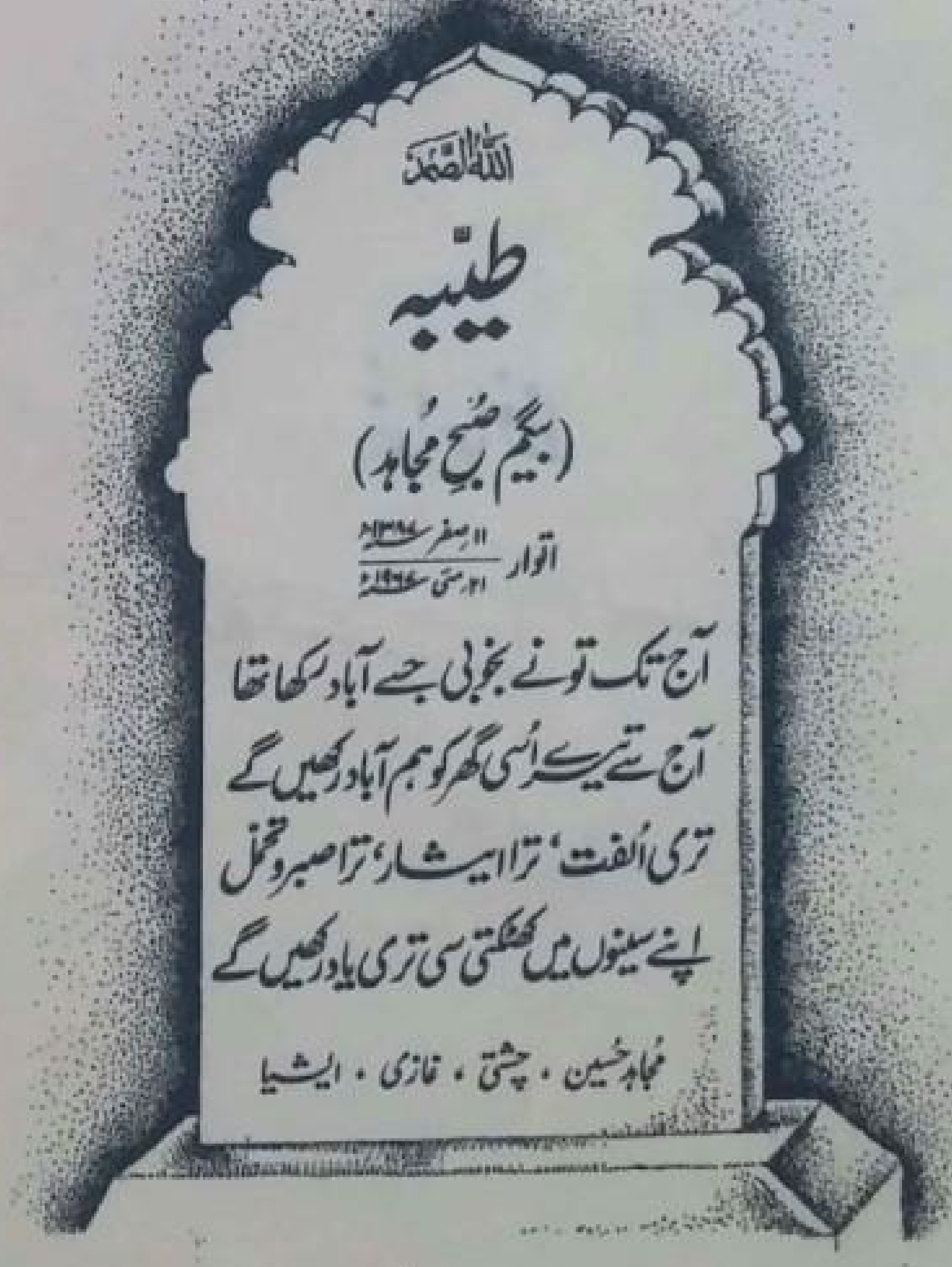
"جسارت" کراچی ۸ جون ۱۹۷۰ء

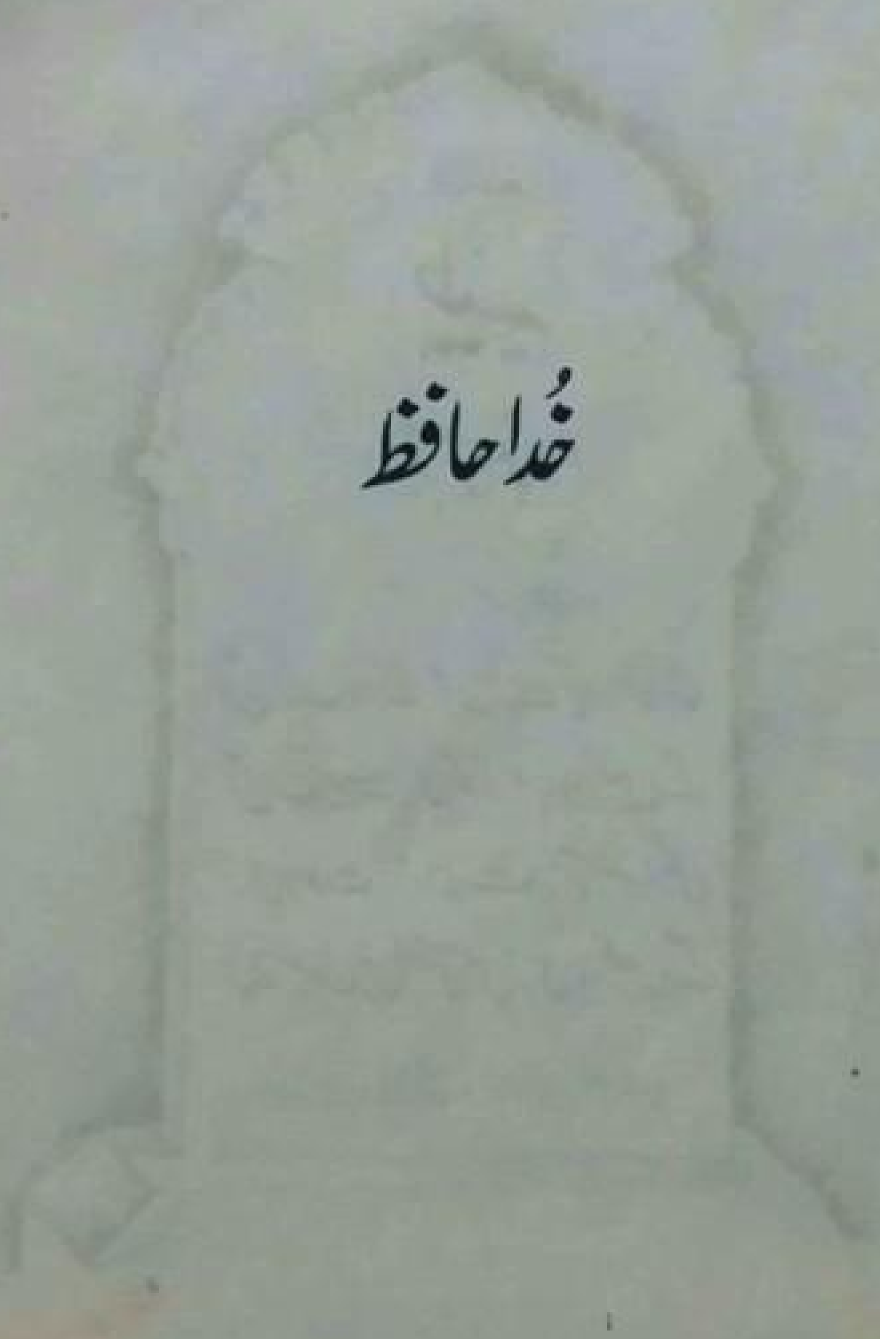
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ



مُجاہد حُسین ــ صُبیح مجاہد کی قبر پر

کتبہ


اللہ الصمد
طیبہؒ
(بیگم صُبحِ مُجاہد)
اتوار
۱۱ صفر ۱۳۹۶ھ
۱۰ مئی ۱۹۷۶ء
آج تک تو نے بخوبی جسے آباد رکھا تھا
آج سے تیرے اُسی گھر کو ہم آباد رکھیں گے
تری اُلفت، ترا ایثار، ترا صبر و تحمل
اپنے سینوں میں کھٹکتی سی تری یاد رکھیں گے
مُجاہد حسین ۔ چشتی ۔ غازی ۔ ایشیا


خُدا حافظ